اورحان کمال
ناظم حکمت کے ساتھ جیل
بنکیشور رونا کے تعارف کے ساتھ

پیشِ خدمت ہے "کتب خانہ" گروپ کی طرف سے ایک اور کتاب

پیشِ نظر کتاب فیس بک گروپ "کتب خانہ" میں بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے۔ گروپ کا لنک ملاحظہ کیجیے :

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share
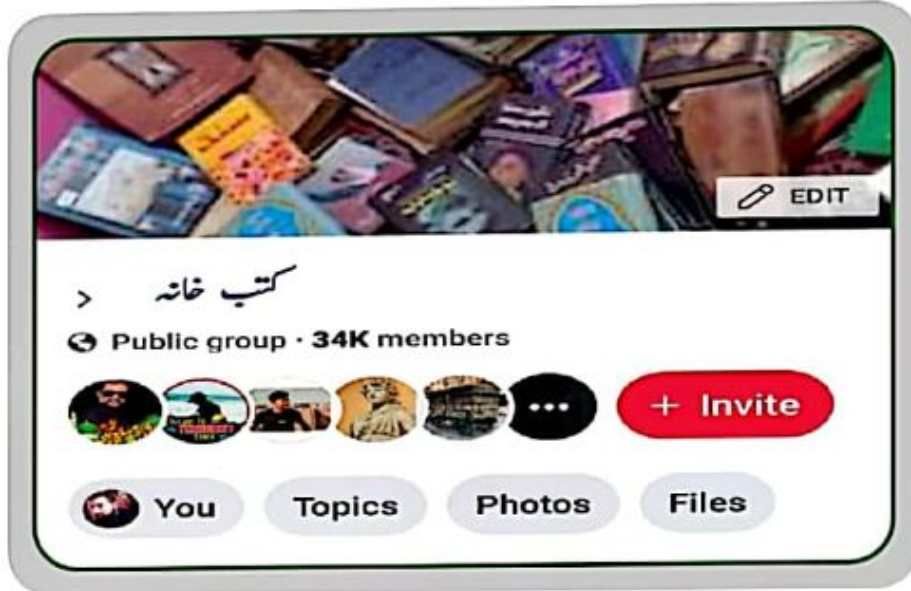
عقابی : +923055198538

محمد اطہر اقبال : +923340004895

محمد قاسم : +971543824582

میاں شاہد عمران : +923478784098

میر ظہیر عباس روستمانی : +923072128068

اورحان کمال

ناظم حکمت کے ساتھ جیل

بنگیشو رونا کے تحریر کردہ تعارف کے ساتھ

مترجم: اعجاز احمد رانا

جمہوری پبلیکیشنز

Orhan Kemal
In Jail With Nazim Hikmet

Introduction by: Bengisu Rona

Published by arrangement with Saqi Books, London

Urdu Translation "Nazim Hikmet Ke Sath Jail"
Published by Jumhoori Publications - Pakistan
October 2012

Publisher:Farrukh Sohail Goindi

Independent & Progressive Books

• نام کتاب: ناظم حکمت کے ساتھ جیل

• مصنف: اورحان کمال
• مترجم: اعجاز احمد راہا

• اشاعت: اکتوبر 2012ء
• سرورق: مصباح سرفراز

• ناشر: جمہوری پبلیکیشنز لاہور
• جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

ISBN:978-969-9739-17-0

قیمت-/390روپے

اہتمام: فرخ سہیل گوئندی

فہرست

تعارف

بنگیشورونا

اورحان کمال (15 ستمبر 1914ء-2 جون 1970ء)

اُن کا نام محمد رشید اوغتو تھا۔ وہ 1914ء میں ادانہ، ترکی میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد ترکی کی قومی اسمبلی کے پہلے اجلاس کے رکن منتخب ہوئے۔ اس کے بعد اُنہوں نے 1930ء میں پاپولر پارٹی کی بنیاد رکھی۔ اُن کی سیاسی سرگرمیوں کے نتیجے میں اُن کے خاندان کو ہجرت کر کے شام جانا پڑا جس کی وجہ سے اُن کے بڑے بیٹے (اورحان کمال) سیکنڈری سکول کی تعلیم مکمل نہ کر سکے۔ کسی حد تک یہ واقعات اورحان کمال کے خود سوانحی ناول "باپ کا گھر" 1949ء میں درج ہیں۔ اپنے پیش لفظ میں اُنہوں نے اِسے ایک "غیر اہم شخص" کا روزنامچہ کہا ہے۔

بعد میں وہ اپنے پیدائشی قصبے میں واپس چلے گئے جہاں اُنہوں نے کپاس کے کارخانوں میں مختلف نوعیت کی ملازمتیں کیں اور "فائٹ اگینسٹ ٹیوبر کلاسس فاؤنڈیشن" میں بطور کلرک کام کیا۔ زندگی کا یہ دور، ان کی شخصیت سازی میں اَنمٹ اثرات چھوڑ گیا۔ اُنہوں نے 1937ء میں ایک یوگوسلاو تارکِ وطن کی بیٹی سے شادی کی، اُن کے چار ناول (باپ کا گھر، بیکار کے مہ وسال، جمیلہ، بیرک 72 کے قیدی) اسی تلخ دور میں تخلیق ہوئے۔ یہ چاروں ناول جمہوری پبلیکیشنز سے شائع ہو چکے ہیں۔

فوجی ملازمت کے دوران 1939ء میں اُنہیں اپنے سیاسی نظریات کی وجہ سے پانچ سال قید کی سزا ہوئی۔ بُرصہ کی جیل میں ناظم حکمت کے ساتھ تعلق کے دوران اُن کے سوشلسٹ نظریات، اورحان کمال کی شخصیت پر اثر انداز ہوئے۔ اسیری پر مبنی اُن کی یادداشتیں کتابی شکل میں بھی شائع ہو چکی ہیں۔ 1951ء میں وہ استنبول منتقل ہو گئے جہاں اُنہوں نے قلم کو زندگی کا وسیلہ بنا لیا۔

اُن کی تحریریں عموماً اُن لوگوں کی زندگیوں کا احاطہ کرتی ہیں جو زندہ رہنے کے لیے جدوجہد کر رہے ہوں۔ بیسویں صدی کی تیسری دہائی کے دوران اپنے تجربات کو موضوع بنا کر اُنہوں نے مختلف موضوعات کو قلم زد کیا: کھیت اور کارخانہ مزدور کے مسائل، بڑے شہروں میں تارکینِ وطن مزدوروں کی بیگانگی، جیل کے قیدیوں کی زندگی، فرض کی اندھی وفاداری، بالک (بچوں کی) غربت اور عورتوں پر تشدد اور اُن کا استحصال اُن کے موضوعات تھے۔ اُنہوں نے 38 کتابیں تحریر کیں (28 ناول اور 10 افسانے) اور اِن میں کچھ پر فلمیں اور ڈرامے بھی بن چکے ہیں۔

اپنی اس کوشش میں کہ وہ لوگوں کو اپنی زندگیوں میں زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کی حوصلہ افزائی کریں، اپنی تحریروں میں وہ کبھی الگ ناظر نہیں بنے۔ اس کاوش میں وہ ایسا ریلزم استعمال کرتے ہیں جو محتاط ہونے کے ساتھ ساتھ نصیحت انگیز بھی ہے۔

1970ء میں صوفیہ (بلغاریہ) میں اُن کا انتقال ہوا، وہ استنبول میں دفن ہیں۔

دیباچہ

زیر نظر کتاب میں اس پس منظر کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے جس کے باعث ترکی کے معروف شاعر ناظم حکمت اور دیگر کئی ابھرتے ہوئے اور ثقہ مصنفین ملکی تاریخ کے مضطرب ادوار میں حراست میں رہے۔ اگرچہ تفصیلات مختلف تھیں لیکن بعد کے برسوں میں ان ادیبوں کے خلاف کارروائیوں کی بنیاد ایک ہی رہی۔ اورحان کمال نے اپنی عمر کی بیسویں دہائی میں کڑی سزا کاٹی لیکن ذو معنی طور پر یہ ان کی ایک ادیب کے طور پر تربیت کا دور تھا۔

کتاب کے دوسرے حصے ''ناظم حکمت کے ساتھ ساڑھے تین برس'' میں اورحان کمال کی ذہنی نشوونما کی جانب اشارے ملتے ہیں۔ یہ ان کی یادداشتوں کا مجموعہ ہے جس میں اورحان کمال نے بیان کیا ہے کہ ناظم حکمت کس طرح بورصہ جیل میں پہنچے اور کیسے جیل میں ناظم کی آمد کے موقع پر تعارف کے پہلے لمحے ہی سے دونوں میں دوستی پروان چڑھنے لگی۔ جیل میں اکٹھے گزارے جانے والے وقت میں اورحان کمال نے ناظم حکمت کی رضا سے ان پر تحریریں لکھنی شروع کیں جو ان کے مزاج، خیالات، ان کے احساسات اور حتیٰ کہ ان کے تاثرات پر مشتمل تھیں۔ وہ انہیں بعد میں ناظم پر ایک کتاب کی صورت میں شائع کروانا چاہتے تھے۔ بدقسمتی سے ان کی وہ تحریریں محفوظ نہ رہ سکیں۔ بعدازاں اورحان کمال نے اپنی یادداشت کے بل بوتے پر جو کچھ بھی انہیں اُن دنوں کے متعلق یاد تھا تحریر کیا اور ان میں اپنی ڈائری کے بچ رہنے والے اوراق اور ستمبر 1943ء میں جیل سے اپنی رہائی کے بعد موصول ہونے والے ناظم حکمت کے کچھ خطوط کا اضافہ کیا۔ ناظم کو اگلے تقریباً سات برسوں تک جیل میں رہنا تھا۔

1933-34ء میں وہاں وقت گزارنے کے بعد ناظم، بورصہ جیل میں اجنبی نہ تھے۔اس مرتبہ بورصہ میں آمد گویا سکون بخش تھی کیوں کہ اپنی گرفتاری کے وقت سے انہیں انقرہ اوراستنبول کی جیلوں میں رکھا گیا تھا،بشمول بحری جہازوں یاوز (Yavuz) اورارکین (Erkin) پر بالخصوص سخت ادوار کے۔اگست 1938ء میں انہیں استنبول کی سلطان احمت جیل میں لے جایا گیا جہاں کمال طاہران کے ساتھی قیدی تھے جنہیں ترکی کا سرکردہ ناول نگاراور ناظم کا قریب ترین دوست بننا تھا۔کمال طاہر (1910-1973ء) کو ناظم کی طرح مبینہ طور پر بحریہ میں بغاوت کوہوا دینے پر گرفتار کرنے کے بعد جیل میں ڈالا گیا تھا۔انہیں 15 سال کی سزا سنائی گئی تھی جب کہ ناظم کو 38 سال کی۔بعدازاں دونوں کو چانکیری (Çankiri) جیل منتقل کردیا گیا لیکن جب ناظم کر بورصہ بھیجا گیا تو طاہر چانکیری میں ہی رہے۔

چانکیری، انقرہ کے شمال میں وسطی اناطولیہ میں واقع ہے اور وہاں موسم سرما شدید ہوتا ہے۔ بورصہ معدنی چشموں والا ایک صحت افزا شہر ہے۔ ناظم نے بورصہ منتقلی کے لیے درخواست کی تھی جو استنبول سے قریب تھا اور کم شدید آب وہوا رکھتا تھا اور جہاں وہ معدنی چشموں پر اپنا علاج کرواسکتے تھے۔بالآخر دسمبر 1940ء میں وہ بورصہ منتقل ہوگئے۔

نئی جمہوریہ کے ابتدائی عشرے پرآشوب سال تھے،کتاب کے تعارف میں اسی لیے وہ تاریخی پس منظر بیان کیا گیا ہے تاکہ اورحان کمال کے حوالے سے واقعات کا سیاق وسباق فراہم کیا جاسکے اوراس مائنڈ سیٹ پر روشنی ڈالی جاسکے جس کا نتیجہ دونوں ثابت شدہ اور نوآموز ادیبوں کے خلاف مسلسل کارروائی کی صورت میں نکلا۔

1950ء اور 1960ء کی دہائیاں جب اورحان کمال کی تحریریں بہ کثرت شائع ہو رہی تھیں،تب ترکی کے ممتاز ادیب اپنی وہ بڑی تحریریں لکھ رہے تھے جنہیں جدید ترک ادب میں کلاسک قرار دیا جاتا ہے۔ان میں سب سے نمایاں اورحان کمال، یشار کمال اور کمال طاہر ہیں جنہیں "تین کمال" (Uç Kemaller) کے نام سے جانا جاتا ہے، جو اس دور میں ممتاز رہے۔ یہ کتاب اس شخصیت کا تعارف پیش کرتی ہے جنہوں نے سب سے کم عمری میں وفات پائی لیکن انہیں آج تک اُن لوگوں کی محبت حاصل ہے جن کے لیے انہوں نے لکھا، یعنی اورحان کمال۔

بنگیشو رونا

زیرِ عتاب ادیب

بورصہ جیل میں پہنچنے والے اورحان کمال اور ناظم حکمت دونوں بالکل مختلف پس منظر کے حامل تھے، لیکن ان کے مقدمات اور گرفتاری کی نوعیت میں بہت زیادہ مماثلت پائی جاتی تھی۔ گرفتاری کے بعد دونوں پر فوجی عدالتوں میں مقدمات چلائے گئے تھے۔ ناظم کو فوج اور بحریہ میں بغاوت پر اکسانے کے دو مختلف مقدمات میں سزا سنائی گئی تھی۔ اورحان کو، جنہوں نے اپنی پہلی بیٹی یلدز (جس کا ذکر ہمیں ناظم کے خطوط میں ملتا ہے) کی پیدائش کے بعد ابھی فوج میں اپنی ملازمت کا آغاز ہی کیا تھا، 1938ء میں ایک بیرونی ریاست کی جانب سے پروپیگنڈا کرنے اور بغاوت پر ابھارنے کے جرم میں سزا سنائی گئی تھی۔ انہیں پانچ سال کی قید کا حکم سنایا گیا تھا جو انہوں نے تقریباً مکمل طور پر کاٹی۔ ناظم کو حکام زیادہ خطرناک خیال کرتے تھے، انہیں 28 سال کی سزا سنائی گئی اور 1950ء میں عام معافی تک انہیں رہائی نصیب نہ ہو سکی۔

اگرچہ ناظم حکمت ایک پختہ مارکسٹ تھے، دونوں اشخاص پر چلائے گئے مقدمات انصاف کا کھلم کھلا استہزا تھے۔ اورحان کمال پر ان کے ساتھی فوجیوں نے الزام لگایا تھا۔ ان کے سامان سے میکسم گورکی کی ایک کتاب، مارکسٹ نظریات کے بارے میں اخباروں کے چند تراشے اور ناظم حکمت سے منسوب ان کی چند نظمیں برآمد ہوئی تھیں۔ ناظم کو ملٹری اکیڈمی سے کیڈٹوں کے ایک گروپ کے ساتھ گرفتار کیا گیا تھا۔ یہ کیڈٹس بائیں بازو کی کتابیں پڑھتے تھے اور مارکسزم

پر گفتگو کرتے رہتے تھے اور ان میں سے ایک نے ناظم سے دو مرتبہ ملاقات کی تھی جس کی وجہ شاید یہ تھی کہ وہ اس کے معترفین میں سے تھا۔ ناظم کو کچھ شک گزرا، انہوں نے اسے چلے جانے کو کہا اور یہ خیال کرتے ہوئے کہ کیڈٹ ایک مخبر تھا جو انہیں پھنسوانے کے لیے آیا تھا، پولیس چیف کو شکایت درج کروادی۔ ان پر دوسرا مقدمہ اس الزام کے تحت چلایا گیا کہ وہ بحریہ کے نوجوانوں میں بائیں بازو کی سرگرمیوں کو فروغ دے رہے ہیں، جو کہ دراصل ادب پر گفتگو کرنے کے لیے اکٹھے ہوتے تھے۔ ایسے کوئی شواہد موجود نہ تھے کہ ناظم کا بحریہ کے آدمیوں سے کسی قسم کا رابطہ تھا، لیکن ان پر متوقع بغاوت کو ابھارنے کا الزام عائد کیا گیا۔

جس وقت فوجی عدالت ان مقدمات کی سماعت کر رہی تھی اس وقت دوسری عالمی جنگ کے بادل منڈلا رہے تھے، عالمی صورتِ حال بے یقینی کا شکار تھی اور مصطفی کمال اتاترک زندگی کے آخری ایام گزار رہے تھے۔ وہ شدید بیمار تھے اور ترکی کی اہم شخصیات جانشینی کی دوڑ میں مصروف تھیں۔ دی جانے والی سزاؤں کی شدت اور ان خطرات کو سمجھنے کے لیے جو ترکی میں 1930ء کے عشرے کے آخری حصے میں مارکیٹ سوچ سے اور خاص طور پر ناظم حکمت سے اور مسلح افواج کے اندر محسوس کیے جا رہے تھے، ضروری ہے کہ پہلی عالمی جنگ کے بعد سے ترکی میں کمیونسٹ سرگرمیوں اور نوزائیدہ ترک جمہوریہ اور اس کے شمال مشرقی ہمسائے سوویت یونین (روس) کے درمیان تعلقات کو تاریخ کے حوالے سے سمجھا جائے۔

بیشتر انیسویں صدی اور بیسویں صدی کے ابتدائی برسوں کے دوران، زار کا روس ترکی کے لیے اہم خطرہ تھا۔ استنبول اور اناطولیہ کے علاقوں میں وقفے وقفے سے مسلمان مہاجرین کی یلغار ہوتی رہی تھی جو بلقان، کریمیا، اور قفقاز (کوہ قاف) کے علاقوں سے روس کی تاریخی پیش قدمیوں کے نتیجے میں اور سربوں، یونانیوں اور بلغاریوں کی آزادی کی تحریکوں کے باعث بھاگ بھاگ کر آ رہے تھے۔

تاہم پہلی عالمی جنگ کے نتیجے میں بالشویک اور ترک قوم پرست دونوں اپنی بقا کی جدوجہد میں مصروف تھے۔ ان میں سے کوئی بھی ترکی کی مشرقی سرحد پر ترک روس جنگوں کی دوبارہ شروعات یا پہلی عالمی جنگ کی مہمات کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ دونوں کو اتحادی قوتوں سے

فوری خطرے کا سامنا تھا۔ ترکی جو کہ 1912ء میں بلقان جنگوں کی ابتدا سے مسلسل لڑ رہا تھا، 1919ء میں اسے جنوبی اناطولیہ میں اطالویوں کے حملے اور ازمیر اور بحیرۂ ایجن کی ساحلوں پر یونانیوں کے حملے کا سامنا تھا، فرانسیسی افواج پہلے ہی ادانہ کے اردگرد کے علاقہ پر قابض تھیں۔ استنبول پر اگرچہ مارچ 1920ء تک رسمی طور پر قبضہ نہیں تھا، لیکن 1918ء کی عارضی صلح کے بعد سے عملاً شہر کے اختیارات اتحادی افواج کے پاس تھے۔

ان حالات میں اناطولیہ میں قوم پرستوں اور ماسکو میں بالشویکوں کا ایک دوسرے کے تعاون کا متلاشی ہونا قدرتی امر تھا۔ 1919ء کے وسط میں انقرہ کے قوم پرستوں میں بالشویکوں کے ساتھ جنگی حکمت عملی میں تعاون کے لیے بحث مباحثہ ہو رہا تھا۔ مصطفیٰ کمال کی رائے تھی کہ ترکی کو بالشویکوں اور اتحادی قوتوں کے درمیان ہونے والے جھگڑے میں غیر جانب دار رہنا چاہیے، لیکن ماسکو کے ساتھ فوری رابطہ کرنا چاہیے کہ آیا وہ ضرورت پڑنے پر ہتھیار، اسلحہ، ساز و سامان، رقم اور اگر ضروری ہو تو افرادی قوت مہیا کر سکتا ہے یا نہیں۔ وہ نئی آزاد ہونے والی جمہوریتوں آرمینیا، جارجیا اور آذربائیجان کو ایک ممکنہ خطرے کے طور پر دیکھتے تھے، جیسا کہ برطانیہ انہیں ترک قوم پرست افواج پر مشرق کی جانب سے حملہ کرنے کے لیے استعمال کر سکتا تھا۔ وہ ان ریاستوں کو بالشویکوں کی جانب سے ہتھیاروں اور اسلحہ کی ممکنہ سپلائی کے راستے میں ایک زمینی رکاوٹ بھی خیال کرتے تھے۔

مارچ 1920ء میں استنبول پر رسمی قبضہ کے بعد اپریل میں ترکی کی گرینڈ نیشنل اسمبلی کا انقرہ میں اجلاس ہوا۔ اسمبلی کا صدر منتخب ہونے کے دو روز بعد 26 اپریل کو مصطفیٰ کمال نے ماسکو کو ٹیلی گرام بھیجا جس میں مظلوموں کو سامراجی حکومتوں سے بچانے کی بالشویکوں کی جدوجہد میں تعاون کرنے کے لیے رضامندی کا اظہار کیا گیا تھا۔ انہوں نے سونے، اسلحے اور ساز و سامان کے بدلے قفقاز (کوہ قاف) میں ان کی مدد کرنے کی پیشکش کی۔

اُسی روز ریڈ آرمی، آذربائیجان میں داخل ہو گئی اور اس نے دو روز بعد جمہوریہ کا کنٹرول سنبھال لیا۔ مئی میں ترک گرینڈ نیشنل اسمبلی نے اپنے وزیر خارجہ کو ماسکو بھیجا اور ترک قیادت نے اپنی توجہ آرمینین جمہوریہ پر مبذول کر دی جو ترک شہر کارس (Kars) پر قبضہ کر رہے

تھے۔ 30 اکتوبر 1920ء کو کارس پر ترکوں کا قبضہ ہو گیا اور پھر دسمبر میں بالشویکوں نے آرمینیا کی حکومت سنبھال لی۔

اس دوران استنبول میں حکومت عثمانیہ 10 اگست 1920ء کو سیور کے معاہدہ پر دستخط کر چکی تھی جس کا مقصد سلطنت عثمانیہ اور فاتح قوتوں کے درمیان جنگ کا خاتمہ تھا۔ اس کو کبھی بھی ترک گرینڈ نیشنل اسمبلی نے قبول نہ کیا اور نہ ہی اس کا نفاذ ہوا، اسے سیاسی طور پر کہیں سے بھی پذیرائی حاصل نہ ہو سکی۔ ان حالات میں ماسکو ایک فطری اتحادی بن گیا۔ 16 مارچ 1921ء کو ماسکو میں دوستی کے ایک معاہدے پر دستخط ہو گئے۔

قبضے کی شروعات پر نوجوان ناظم حکمت ابھی تک استنبول میں ہی تھے۔ لیکن ان کے ساتھی مصطفین پہلے سے ہی انقرہ میں موجود تھے اور نومبر 1920ء کو انہیں اور ان کے ایک ساتھی شاعر اور دوست ولا نورالدین کو ان کی جانب سے انقرہ آنے کا دعوت نامہ وصول ہوا۔ آخر کار ان دونوں نے سلطنت عثمانیہ کے دارالحکومت کو خیر باد کہا، ایک کشتی میں بحیرۂ اسود کے ساحل کے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہوئے انابولو کی بندرگاہ پر پہنچ گئے، جہاں انہیں انقرہ جانے کے لیے سفری اجازت نامے حاصل کرنے کی ضرورت تھی۔ شہر ایسے اجازت ناموں کے حصول کے منتظر لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ وہاں ان کی ملاقات بہت سے ترک طالب علموں سے ہوئی جو 1919ء میں برلن میں ہونے والی بائیں بازو کی جرمن سپارٹکس بغاوت میں شامل تھے جس کے نتیجے میں انہیں جرمنی سے نکال کر واپس ترکی بھجوا دیا گیا تھا۔ اس طرح انابولو میں گزارے جانے والے دو ہفتوں کے دوران دونوں شاعروں کو کیمونسٹ نظریات سے متعارف ہونے کا موقع ملا۔ آخر کار ناظم اور ولا نورالدین کے اجازت نامے پہنچ گئے اور انہوں نے پہاڑی راستوں پر انقرہ کی جانب اپنے دو ہفتوں کے کٹھن سفر کا آغاز کر دیا۔

انقرہ میں ایک دوسری نئی آمد سوویت قونصل کی تھی اور قونصلیٹ مختلف انقلاب پسند گوریلوں کا مرکز بن گیا تھا۔ نوجوان قوم پرستوں میں مارکسٹ نظریات گردش کر رہے تھے اور ان کی اپنی بقا کے لیے جدوجہد اور بالشویکوں کی جدوجہد میں بہت سی مماثلتیں پائی جاتی تھیں۔ دوستی کے معاہدے پر دستخط ہونے کے بعد یہ بات حیران کن نہیں تھی کہ کیمونسٹ ہمدرد پیدا ہونے شروع

ہو گئے تھے اور وہ اپنی آواز بلند کر رہے تھے۔

جس دوران مصطفیٰ کمال اپنے قومی مقاصد کی خاطر سوویت یونین کی عملی حمایت حاصل کرنے کے بہت زیادہ خواہاں تھے، وہ ان خطرات سے بھی پوری طرح آگاہ تھے جو ان کی قیادت کو انقرہ سے باہر اناطولیہ کے علاقے میں سرگرم کیمونسٹ انقلابیوں سے لاحق ہو سکتے تھے۔ باکو (Baku) جو کہ اب سوویت یونین کے زیر تسلط تھا، وہاں ترک کیمونسٹ پارٹی نے ستمبر 1920ء میں اپنا اجلاس کیا۔ اس میں انہوں نے انقرہ کو قوم پرست جدوجہد میں اپنے تعاون کے پیغامات بھیجے۔ لیکن پارٹی اس کے ساتھ ساتھ ترکی میں اپنے حامیوں کی تنظیمیں قائم کرنے کے لیے بھی کام کر رہی تھی۔ اجلاس میں اس امر کی وضاحت کی گئی کہ قوم پرستوں کے ساتھ تعاون ایک عارضی مصلحت کاری ہے، اصل ہدف اقتدار پر محنت کش طبقے کے قبضے کے لیے راہ ہموار کرنا ہے۔

مصطفیٰ کمال 1920ء کے موسم بہار میں ایک خفیہ سیاسی تنظیم کے ابھرنے پر تشویش میں مبتلا تھے، جسے ''گرین آرمی'' (Green Army) کا نام دیا گیا تھا۔ یہ ایک بڑا غیر منظم گروہ تھا جو ظاہری طور پر اسلام کے دائرہ کار کے اندر رہتے ہوئے انقلابی سوشلسٹ سوچ کا حامل تھا۔ اس کے حمایتی اسمبلی میں بھی موجود تھے، لیکن اسکی شہر (Eskişehir) کے علاقے میں یہ زیادہ مضبوط تھا جو کہ قوم پرستوں کی اہم بے قاعدہ یونٹوں میں سے ایک یونٹ کے سرکیشیائی کمانڈر ادھم کے کنٹرول میں تھا۔ ادھم، انور پاشا اور 1908ء کے انقلاب کے پس پشت ''جمعیت اتحاد و ترقی'' (کمیٹی آف یونین اینڈ کانگرس)(Ittihat ve Terakki Cemiyiti) کے پُرجوش حامیوں میں سے تھا جو کہ پہلی عالمی جنگ کے دوران حکومت پر قابض رہی تھی اور اس کے بہت سے پیروکار (خاص طور پر سرکیشیائی) سلطنتِ زار کی محکوم اقوام کو آزادی دلانے کے لیے لینن کے جذبے اور عزم سے بہت متاثر تھے اور اسی وجہ سے انہوں نے کیمونسٹ نظریات کو اپنا لیا تھا۔ اسکی شہر مارکسٹ نظریے اور اشاعتی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا تھا۔

مصطفیٰ کمال خطرے کو بھانپ چکے تھے۔ وہ اپنے نئے منتخب وزیر داخلہ سے پہلے ہی استعفیٰ لے چکے تھے جس کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ وہ کیمونسٹ ایجنٹ ہے اور انہیں خدشہ تھا کہ باکو میں ترکش کیمونسٹ پارٹی کے سربراہ مصطفیٰ صوفی کے ایجنٹ ترکی میں سوویت نواز انقلاب

کی راہ ہموار کر رہے ہیں۔ ستمبر 1920ء کو غداری کے قانون کو توسیع دے کر اس کا دائرہ کار سیاسی اور فوجی دونوں طرح کی بغاوتوں تک بڑھا دیا گیا اور اکتوبر میں مصطفیٰ کمال نے اپنے پیروکاروں کو ایک سرکاری ترک کمیونسٹ پارٹی تشکیل دینے کی ہدایت کی اور حکم دیا کہ اب تمام قانونی کمیونسٹ سرگرمیاں اس پارٹی کے ذریعے ہی ہوں گی۔ اس طرح یہ امید کی گئی تھی کہ اب قوم پرست تحریک کو یہ موقع مل سکے گا کہ وہ انقلابی مارکسٹوں کی توانائیاں استعمال کرتے ہوئے حکومت کو اس قابل بنا سکے کہ وہ بغیر کمیونسٹ مخالف ظاہر ہوئے ترکی کے اندر ماسکو کے حمایت یافتہ کمیونسٹوں کے خلاف کارروائیاں کر سکے۔

اس سرکاری پارٹی نے اناطولیہ میں کمیونسٹوں کے درمیان بہت سی غلط فہمیوں اور پریشانیوں کو جنم دیا، خاص طور پر جب یہ اعلان کیا گیا کہ سرکاری ترک کمیونسٹ پارٹی، گرین آرمی کو اپنی تحویل میں لے رہی ہے۔ پھر ترک فوج، ادھم کے خلاف حرکت میں آئی جسے 1921ء کی ابتدا میں شکست دے دی گئی۔ وہ خود فرار ہو گیا اور حملہ آور یونانی فوج میں شامل ہو گیا۔

اس موقع پر باکو کی ترک کمیونسٹ پارٹی کے چیئرمین مصطفیٰ صوفی نے ترکی جانے کا فیصلہ کیا۔ وہ پہلے کارس گیا، جہاں اس نے چند ہفتے قیام کیا اور کاظم پاشا سے ملاقات کی۔ 22 جنوری 1921ء کو وہ ریل گاڑی کے ذریعے ارضِ روم گیا جہاں اسے معاندانہ مظاہروں کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ طرابزون چلا گیا، جہاں اسے مزید مظاہروں کا سامنا کرنا پڑا اور اس نے کشتی کے ذریعے وہاں سے انقرہ جانے کا فیصلہ کیا۔ 28 جنوری کو وہ اپنے وفد کے ساتھ بندرگاہ کے انچارج یحییٰ کاہیا کی مہیا کردہ کشتی پر سوار ہو گیا جو کہ انور پاشا کا قریبی ساتھی تھا۔ صوفی اور اس کے ساتھی، تمام کے تمام طرابزون چھوڑنے کے فوراً بعد پُراسرار حالات میں مار دیئے گئے۔ آیا کہ یحییٰ نے یہ قدم اپنے طور پر اٹھایا جو انور کے ممکنہ حریف کے طور پر صوفی سے انتقام لینا چاہتا تھا یا وہ انقرہ سے ملنے والی ہدایات پر عمل کر رہا تھا، واضح طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن اس قتل نے ماسکو نواز کمیونسٹ پارٹی کا مستقبل قریب میں انقرہ کے لیے خطرہ بننے کے امکان کو ختم کر دیا، ترک کمیونسٹوں اور ناظم نے یقیناً انقرہ کو اس کا الزام دیا۔

اس واقعے نے ناظم کی سیاسی بالیدگی میں تشکیلی کردار ادا کیا۔ اگرچہ انہیں

تک ان قتلوں کے بارے میں علم نہ ہوا۔ اس کے نتیجے میں انہوں نے ان کے بارے میں نظم "پندرہ کے لیے" (Onbeşler için) اور ایک منظوم ڈرامہ "28 جنوری" (28 Kânunisani) تحریر کیے۔

وہ اور ولا نور الدین، انقرہ پہنچنے کے بعد قومی افواج میں بھرتی کیے جانے کی توقع رکھتے تھے۔ لیکن یہ نہ ہوا اور اپریل 1921ء میں انہیں انقرہ کے مغرب میں ایک چھوٹے سے قصبے بولو میں سکول اساتذہ کے طور پر بھیج دیا گیا۔ وہ ستمبر تک وہاں رہے اور فارغ وقت میں اپنے ہم خیال دوستوں کے ساتھ لٹریچر اور سیاست پر بحث ومباحثہ کرتے رہے، اور پھر انہوں نے سوویت یونین کے زیر اقتدار جارجیا میں باتم (باتمی) (Batum) کی بندرگاہ جانے کا فیصلہ کیا۔ وہ کشتی پر طرابزون گئے اور اپنے آپ کو کارس میں استاد مقرر کروایا اور کہا کہ وہاں جانے کے لیے انہیں براستہ باتم جانے کی ضرورت ہے۔ اس طرح وہ سرحد عبور کرنے کا اجازت نامہ لینے میں کامیاب ہو گئے۔ جب وہ طرابزون میں تھے تو انہیں پتا چلا کہ مصطفیٰ صوفی اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ وہ باتم گئے اور وہاں ترک کمیونسٹ پارٹی کے ممبر بن گئے۔ اگلے سال انہوں نے ماسکو جانے کے لیے ریل گاڑی کا انتخاب کیا، راستے کے مناظر نے انہیں نظم "فاقہ زدہ آنکھیں" (Açlarin G.özbebekleri) کے لیے تحریک مہیا کی۔

ستمبر 1921ء میں جس وقت ناظم نے ترکی کو چھوڑا، مغربی اناطولیہ میں یونانیوں کے خلاف جنگ ترکوں کے حق میں تبدیل ہو رہی تھی۔ جنگ سقاریہ کی کامیابی کے بعد مصطفیٰ کمال کو ماسکو سے رقم اور اسلحہ کی مسلسل ضرورت تھی اور وہ چند ترک کمیونسٹوں کو جنہیں گرفتار کیا گیا تھا، معاف کرنے پر راضی ہو گئے۔ تاہم اگلے سال یونانیوں پر فیصلہ کن فتح حاصل ہو گئی اور سوویت حمایت زیادہ اہم نہ رہی۔ اکتوبر اور نومبر میں کمیونسٹوں کی پکڑ دھکڑ شروع ہو گئی، جن پر موجودہ نظام کو ختم کرنے کی منصوبہ بندی کا الزام تھا۔

ناظم، دسمبر 1924ء میں ترکی واپس آئے۔ اس وقت تک ملک جمہوریہ بن چکا تھا اور مصطفیٰ کمال حزب مخالف کی ایک پارٹی کی تشکیل کی حوصلہ افزائی کر چکے تھے۔ ایک ماسکو نواز بائیں بازو کی پارٹی کھلم کھلا کام کر رہی تھی اور انقرہ حکومت پر زیادہ سے زیادہ نکتہ چینی کر رہی تھی۔

ناظم، استنبول واپس آ گئے جو کہ ابھی تک نشر و اشاعت کا مرکز تھا اور ماسکو نواز پارٹی کے دو اخباروں Aydınlık اور Orak Çekiç کے لیے لکھنا شروع کر دیا۔ تاہم اس کی تمام سرگرمیاں آئندہ سال اچانک ختم ہو گئیں جب عمومی طور پر حکومت مخالف سرگرمیوں پر پابندیاں لگا دی گئیں۔

یہ ملک کے جنوب مشرق میں جنم لینے والی ایک بڑی بغاوت کے خلاف ردِ عمل تھا، جس کی قیادت نقشبندی مسلک کے ممتاز رہنما پالو سے تعلق رکھنے والے شیخ سعید کر رہے تھے۔ مارشل لاء کا نفاذ کر دیا گیا تھا اور حکومت کو کسی بھی تنظیم یا کسی بھی قسم کی مطبوعات کو، جنہیں وہ تخریبی سرگرمیوں میں ملوث خیال کرے، بند کرنے اور ذمہ دار افراد پر مقدمات چلانے کے لیے خصوصی عدالتیں، جنہیں ''انڈیپنڈنس ٹریبونلز'' کا نام دیا گیا، قائم کرنے کا اختیار دیا گیا تھا۔ ترک کمیونسٹ پارٹی نے اس بغاوت کی مذمت کی جس کا بظاہر مقصد شریعت کی بحالی تھا لیکن وہ کرد قومیت کے جذبات کو بھی ابھار رہی تھی۔ تاہم 30 مارچ 1925ء کو Aydınlık کے عملے کو گرفتار کر لیا گیا۔ ناظم، ازمیر فرار ہو گئے جہاں سے وہ ماسکو پہنچ گئے۔ انہیں ان کی عدم موجودگی میں پندرہ سال قید کی سزا سنا دی گئی، اس سب کی پیش بینی جو آگے ہونا تھا۔ اس معاملے میں اکتوبر 1926ء میں انہوں نے عام معافی سے فائدہ اٹھایا، لیکن وہ جولائی 1928ء تک ترکی واپس نہ آئے۔ پھر وہ غیر قانونی طور پر ملک میں داخل ہوئے اور بحیرۂ اسود پر واقع ترکی کی آخری بندرگاہ ہوپا (Hopa) پر فوری طور پر گرفتار کر لیے گئے۔ ان پر بہت سے سنگین الزامات لگائے گئے۔ آخرکار چھ ماہ قید رکھنے کے بعد انہیں رہا کر دیا گیا اور وہ استنبول واپس آ گئے۔

1933ء میں تقریباً پانچ سال بعد جب ناظم، بابِ عالی میں لکھنے لکھانے کے کام میں مصروف تھے جو کہ استنبول کے پرانے شہر میں پبلشنگ اور اخبارات کی اشاعت کا مرکز تھا، انہیں افترا پردازی اور ساتھ ہی سیاسی جرائم کے الزام میں ایک مرتبہ پھر گرفتار کر لیا گیا۔ انہیں بورصہ جیل میں منتقل کر دیا گیا جو کہ اگست 1934ء میں عام معافی کے اعلان کے تحت رہا ہونے سے قبل ان کا وہاں حراست کا پہلا دورانیہ تھا۔

اس وقت 1920ء کے عشرے کی نسبت بین الاقوامی صورتِ حال بہت حد تک تبدیل ہو چکی تھی۔ 1932ء میں ترکی، لیگ آف نیشنز میں شامل ہو چکا تھا اور اس کے دو سال بعد سوویت

یونین نے بھی شمولیت اختیار کر لی تھی۔ دونوں ملکوں کے درمیان 1929ء میں دوستی کے معاہدے کی تجدید ہو چکی تھی اور انقرہ، ماسکو کے ساتھ اپنے تعلقات خوشگوار رکھنے کے لیے بہت بے تاب تھا، جب کہ ملک کے اندر کسی بھی قسم کی کمیونسٹ سرگرمی پنپنے نہ دینے کی حکمت عملی بھی جاری تھی۔ ایک سفارتی مسئلہ جس میں ترکی الجھا ہوا تھا وہ آبنائے پر انتظامی اختیارات کا تھا۔ 1923ء کے معاہدہ لوزان کے تحت جس میں ترکی کی سرحدوں کا تعین کیا گیا تھا، ایک بین الاقوامی مشن کو درۂ دانیال سے گزر کر بحیرۂ مرمرا اور باسفورس سے گزرنے والے بحری جہازوں کا انتظام و انصرام سونپا گیا تھا۔ ترکی کو یہ قابل قبول نہ تھا، لہٰذا اس نے اس سلسلے میں لیگ آف نیشنز سے رجوع کیا۔ سوویت یونین اس بارے میں کوئی زیادہ پرجوش نہیں تھا لیکن آخرکار اس نے مونٹراکس کنونشن پر دستخط کر دیے جس نے ترکی کو تجارتی جہازوں کے مفت گزرنے کی یقین دہانی پر انچارج بنا دیا۔

ہٹلر اور مسولینی کی پالیسیوں اور ارادوں کی وجہ سے انقرہ میں موجود قیادت کی تشویش میں روز بہ روز اضافہ ہو رہا تھا۔ سوویت یونین سے اچھے تعلقات دوبارہ ضروری ہو چکے تھے۔ مصطفیٰ کمال اتاترک اور عصمت انونو کی بڑی فکر 1914ء میں عثمانی حکومت کی مہلک غلطی کو دہرانے سے بچنا تھا جس میں ترکی نے پہلی جنگ عظیم میں غلط جانب سے حصہ لیا تھا۔

1938ء میں انونو، برطانیہ اور فرانس سے ایک دفاعی اتحاد قائم کرنے کی کوشش میں تھے، لیکن سوویت یونین کے ساتھ قریبی تعاون بھی ضروری خیال کیا جا رہا تھا۔ مذاکرات کا آغاز ہو چکا تھا لیکن پیشتر اس کے کہ معاہدہ طے پاتا، نازی جرمنی اور سوویت یونین کے درمیان 23 اگست 1939ء کو مولوتوف ربن ٹراپ پیکٹ پر دستخط ہو گئے۔

اس نے ترکی کی منصوبہ بندی پر اہم اثرات مرتب کیے۔ اکتوبر 1939ء کو ترکی نے فرانس اور برطانیہ کے ساتھ معاہدہ انقرہ پر دستخط کر دیے۔ اس معاہدے کے تحت اگر ترکی پر حملہ ہوتا تو دوسرے دو دستخط کنندگان کو اس کی مدد کرنا تھی اور اگر فرانس اور برطانیہ پر حملہ ہوتا تو ترکی کو ان کی مدد کرنا تھی لیکن اس میں ایک ایسی شرط بھی شامل تھی جو ترکی کو استثنا مہیا کرتی تھی۔ اگر اس اقدام کے نتیجے میں سوویت یونین سے جنگ کرنا پڑتی، وہ ایسا کرنے سے انکار کر سکتا تھا۔ معاندانہ صورت حال کے آغاز سے پہلے عصمت انونو کا خیال تھا کہ اتحادیوں کی جیت ہو گی، لیکن

اس کے بعد انہوں نے اپنی تمام تر توانائیاں 1945ء تک ترکی کو غیر جانب دار رکھنے میں صرف کر دیں، جب آخر کار ترکی نے اقوام متحدہ کے بانی ممبر کی اہلیت حاصل کرنے کے لیے جرمنی کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ لیکن اس غیر جانب داری کی نوعیت جنگ کے آگے بڑھنے کے ساتھ ساتھ تبدیل ہو گئی۔

جس طرح جنگ آگے بڑھ رہی تھی ان خبروں پر بورصہ جیل کے قیدیوں کے ردِعمل کے بارے میں اورحان کمال کے بیان سے ہمیں باہر کی دنیا کی سوچ سے آگہی حاصل ہوتی ہے۔ ترکی میں ایک مضبوط جرمنی نواز رائے عامہ پائی جاتی تھی جو کہ عام طور پر قوم پرست دائیں بازو کے افراد تھے، یہ سب جمال اور اس کے پیرکاروں کی طرح جرمنی کو جنگ جیتتے دیکھتے چاہتے تھے۔ جہاں تک جیل کے اندر کی بات تھی، جب تک جرمن پیش قدمی کر رہے تھے، ان کا ستارہ بلند ہو رہا تھا۔ حکومت کی پالیسی بنیادی طور پر جنگ میں دھکیلے جانے سے بچنے کی تھی، لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اس بات کو یقینی بنائے رکھنا چاہتی تھی کہ دونوں جانب کے راستے کھلے رکھے جائیں۔

فرانس 1940ء میں شکست کھا چکا تھا اور 1941ء میں جرمنی نے یوگوسلاویہ اور یونان کو فتح کر لیا تھا اور بلغاریہ اور رومانیہ پر قبضہ کر لیا تھا۔ 18 جون 1941ء کو ترک جرمن دوستی اور عدم جارحیت کے ایک معاہدے پر دستخط ہو گئے تھے۔ چند روز بعد ہٹلر نے سوویت یونین پر حملے کے باربروصا آپریشن کا آغاز کر دیا۔ یہ وہ دور تھا جب ''ناظم حکمت کے ساتھ ساڑھے تین برس'' میں جمال اور آذربائیجانی شخص جیل میں چائے، چاکلیٹ اور مٹھائیاں تقسیم کر رہے تھے۔

اگرچہ 1945ء میں آخر کار ترکی نے جرمنی کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ 19 مارچ کو سوویت یونین نے ترکی کے ساتھ 1925ء کا معاہدہ ختم کر دیا اور جون میں وزیر خارجہ مولوٹوف نے کہا کہ اب سوویت یونین، آبنائے پر سوویت اڈوں کے قیام اور دو مشرقی صوبوں کارس (Kars) اور ارض حان (Ardahan) کی واپسی کا مطالبہ کرے گا جو کہ 1878ء سے 1921ء تک روس کے قبضے میں تھے۔ اس مطالبے سے یہ بات نظر آنے لگی تھی کہ سٹالن، ترکی میں اس سے بڑھ کر بھی نظریں گاڑ سکتا تھا اور یوں جنگ کے بعد کے دور میں انقرہ کی خارجہ اور دفاعی پالیسی میں توسیع پسند سوویت یونین سے ترکی کو بچانے کے لیے کسی حفاظتی حصار کو تلاش کرنے کی کوششیں نمایاں

نظر آنے لگیں۔ ترکی نے 1952ء میں کوریا میں اپنے فوجی بھیجے اور نیٹو (NATO) میں شمولیت اختیار کر لی۔ اس وقت تک عصمت اِنونو ملک کے صدر نہیں رہے تھے، 1946ء میں جب ملک نے اپنے آپ کو مغربی اتحادیوں کے ساتھ جوڑنا شروع کیا، انہوں نے کثیرالجماعتی جمہوریت متعارف کروادی تھی اور 1950ء میں ان کی ری پبلکن پیپلز پارٹی کو انتخابات میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا اور وہ استعفیٰ دے کر قائدِ حزبِ اختلاف بن گئے۔ ناظم کو رہا کر دیا گیا......... لیکن وسطی اور مشرقی یورپ کی حالت زار اور سوویت یونین کے قرب کے پیشِ نظر کیمونزم اب بھی ایک حقیقی خطرہ تھا۔ ناظم اپنے دوستوں اور خاندان کو آہنی پردے کی دوسری جانب چھوڑتے ہوئے ماسکو چلے گئے، اور ان میں سے بہت سے اب ان سے ملاقات نہ کر سکتے تھے۔

اورحان کمال کے والد، عبدالقادر کمالی بے

میرے والد کون تھے، وہ کیا کرتے تھے؟
میں کچھ نہیں جانتا۔

اورحان کمال یہ سوال اپنے پہلے نیم خودنوشتہ ناول "باپ کا گھر" کے دوسرے صفحے پر پوچھتے ہیں۔ ان کے والد، جیسا کہ ناول میں انہیں پیش کیا گیا ہے، کوئی پُرکشش شخصیت کے مالک نہیں۔ ناول میں ان کا پہلا ذکر ہمیں توپ خانے کے ایک سرخی مائل بھوری مونچھوں والے لیفٹیننٹ کے طور پر درۂ دانیال میں اورحان کی پیدائش کا ٹیلی گرام وصول کرتے ہوئے ملتا ہے۔ پھر وہ ایک غضب ناک شخص کے طور پر سامنے آتے ہیں جب گھر میں ہر شام انہیں پتا چلتا ہے کہ پانچ سالہ اورحان صبح کے وقت قرآن کی تلاوت (قدیم عربی رسم الخط میں) کرنے کے بالکل قابل نہیں جس کی سزا اُسے ہر روز ایک اچھی خاصی پٹائی کی صورت میں ملتی ہے۔

باپ کی ناراضی کی وجہ صرف بچہ ہی نہیں تھا، ایک معزز سرکاری افسر ہونے کی حیثیت سے وہ فرش پر بیٹھ کر کھانا خاص طور پر ناپسند کرتے تھے۔ مصنف کی والدہ اپنے خاوند اور سسرالیوں کی ناراضی کے ڈر سے ایسا تبھی کر پاتیں جب والد گھر سے باہر ہوتے، اور اس سے بھی بدترین بات تھی کہ وہ اور بچے ایک مقامی ملازم کی بیوی اور دوسری خواتین کے ساتھ مل کر کھانا

کھاتے جو کہ سسرالیوں کے لیے کسی طور پر بھی قابل برداشت نہ تھا۔ گھر ایک کرائے کا فارم ہاؤس تھا جو کہ یونانی یا آرمینی چھوڑ کر گئے تھے اور اس سے ملحق ایک آؤٹ ہاؤس تھا جو ہمیشہ مقفل رہتا تھا۔ ایک دن ہمسایوں نے سمجھ لیا کہ وہ "میری ماں کو قائل کر چکے تھے کہ وہ انہیں اسے کھولنے دے۔" یہ گھر مختلف گھریلو اشیاء اور کتابوں کی پیٹیوں سے بھرا ہوا تھا، جو وہ اٹھا کر لے گئے۔ جب والد جو کہ ایک سرکاری کام کے سلسلے میں گئے ہوئے تھے، واپس آئے تو وہ یہ دیکھ کر انتہائی غضب ناک ہو گئے کہ اس ملحقہ مکان کے دروازے پر لگی ہوئی سرکاری مہر توڑ دی گئی تھی۔ انہوں نے اپنی بیوی کو بالوں سے پکڑا اور اسے مارنے پیٹنے کے بعد اسلامی قانون کے تحت طلاق دے دی اور اسے اس کے رشتہ داروں کے پاس بھجوا دیا۔ ان کی والدہ اور بہن، یعنی مصنف کی دادی اور پھوپھی نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور گھر میں آ کر سارا انتظام سنبھال لیا اور اسے اوپر سے نیچے تک رگڑ رگڑ کر صاف کر دیا اور اس کے بعد گھر کا نظام مناسب طور پر چلایا جانے لگا۔ فرش پر بیٹھ کر کھانے کے عمل اور ملازم کی بیوی سے تعلقات کا خاتمہ ہو گیا۔

آخر کار والد کو اپنے کیے پر پچھتاوا محسوس ہوا اور دادی کے احتجاج کے باوجود انہوں نے اپنے نکاح کی از سر نو تجدید کی اور والدہ واپس گھر آ گئیں۔ اس کے بعد ناول میں خاندان کی زندگی میں آنے والی مکمل تبدیلی کا ذکر کیا گیا ہے جب والد اچانک جلاوطن ہو جاتے ہیں اور باقی خاندان بھی ان کے پیچھے بیروت پہنچ جاتا ہے۔

اورحان کمال نے اپنے والد کا نقشہ کس قدر خوبی سے بیان کیا ہے، وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ جو بات بالکل واضح نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ ان کے حقیقی والد، اگرچہ وہ کافی عرصہ تک اپنے بیوی بچوں سے دُور رہے، ایک طور پر بااثر کردار کے حامل انسان تھے جنہوں نے 1920ء سے 1930ء کے درمیان ترکی کی سیاسی زندگی میں مختصر لیکن اہم کردار ادا کیا۔

عبدالقادر کمالی نے 1889ء میں ایک چھوٹے سے قصبے عثمانیہ (اب صوبائی دارالحکومت) میں پیدا ہوئے جو کہ جنوب مشرقی ترکی میں ادانہ (Adana) اور عنتاب (اب غازی عنتاب (Gaziantep)) کے درمیان واقع ہے۔ نوجوانی میں وہ استنبول گئے اور قانون کی تعلیم حاصل کرنا شروع کی، لیکن سیاست کی وجہ سے تعلیم مکمل کرنے سے پہلے ہی مشکلات میں گھِر

گئے ۔اس دوران انہوں نے مختلف رسائل میں قانون کے موضوع پر مضامین لکھنے شروع کر دیے اور ''جمعیت اتحاد و ترقی'(İttihat ve Terakki Cemiyiti) میں شمولیت اختیار کر لی۔1912ء میں انہیں اس کی رکنیت رکھنے کی وجہ سے ملنے والی چھ ماہ کی قید کی سزا میں سے تین ماہ جیل میں بسر کرنا پڑے۔تاہم وہ قانون کا امتحان پاس کر گئے اور سرت (Siirt) میں (موجودہ ترکی کے انتہائی جنوب مشرق میں) ڈپٹی پراسیکیوٹر بن گئے اور اس کے بعد بصرہ میں پراسیکیوٹر مقرر ہوئے۔ 1914ء میں انہوں نے حکومتی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور عام لام بندی میں ریزرو آفیسر بن گئے،جیسا کہ ناول میں بیان کیا گیا ہے،وہ درہ دانیال میں تعینات تھے۔

1918ء میں انہیں فارغ کر دیا گیا۔پھر وہ مختلف سرکاری ملازمتیں کرتے رہے اور آخر میں کاستامونو (Kastamonu) کے پراسیکیوٹر مقرر ہو گئے۔وہاں سے وہ 1919ء میں پارلیمنٹ کے لیے کھڑے ہوئے اور باقاعدہ طور پر آخری عثمانی چیمبر آف ڈیپوٹیز کے لیے منتخب ہو گئے،جس کا جنوری 1920ء میں استنبول میں اجلاس ہوا۔قبضے کے بعد اپنے ساتھی نمائندوں کے ساتھ انقرہ چلے گئے اور وزارتِ انصاف میں انڈر سیکریٹری بن گئے۔ یکم نومبر 1920ء کو اسمبلی نے وزیر انصاف کے لیے ان کا انتخاب کیا،لیکن 4 نومبر کو انہوں نے یہ باور کرتے ہوئے کہ انہیں مصطفیٰ کمال کا اعتماد حاصل نہیں،''خرابی صحت کی بنیاد پر''استعفیٰ دے دیا۔جب وہ اسمبلی کے ایک ممبر تھے تو ادانہ کے قریب پوزانتی میں''انڈیپنڈنس ٹریبونل'' کے چیئرمین منتخب ہوئے جو کہ مشرقی صوبوں میں کوچ گیری قبائلیوں کی 1920ء کی بغاوت میں ملوث افراد کو سزا دینے کے لیے ایک عارضی کردار تھا۔وہ اسمبلی کے ممبران کے''پہلے گروپ''(مصطفیٰ کمال کے پر جوش حامی) میں سے نظر آتے ہیں اور نہ ہی دوسرے گروپ میں سے جو کہ زیادہ تر حزبِ مخالف کا کردار نبھا رہے تھے۔

انہوں نے دوبارہ منتخب ہونے کے لیے 1923ء کے عام انتخابات میں حصہ نہ لیا۔ انہوں نے دوبارہ اشاعتی کام اور اخبارات میں لکھنا شروع کر دیا اور دسمبر میں انہیں اپنے مضامین کا دفاع کرنے کے لیے عدالت میں پیش ہونا پڑا۔لیکن انہیں بری کر دیا گیا۔

نومبر 1924ء میں اسمبلی ممبران کے ایک گروہ نے ایک نئی پارٹی پروگریسوری پبلیکن

پارٹی (Terakkipèrvar Cumhuriyet Fırkası) تشکیل دی۔ اس سے حوصلہ پاتے ہوئے عبدالقادر کمالی ایک مختلف تنظیم عوامی دفاعی پارٹی (Müdafaa-i Umumiye Fırkası) کو تشکیل دینے میں مصروف ہو گئے۔ انہوں نے اس کے منشور کا مسودہ اپنے ادانہ کے اخبار میں شائع کیا جسے حکام نے فوری طور پر بند کرایا اور انہیں چھ ماہ قید کی سزا سنادی گئی۔ اس طرح وہ اپنی نئی پارٹی کی بنیاد بنانے کے قابل نہ رہے جو کہ کبھی بھی پروان نہ چڑھ سکی۔ جون 1925ء میں شیخ سعید کی بغاوت کے بعد سیاسی پکڑ دھکڑ میں پروگریسوری پبلیکن پارٹی بھی بند کر دی گئی۔ عبدالقادر کمالی کو مبینہ طور پر بغاوت پر اکسانے کے جرم میں انڈیپینڈنس ٹریبونل میں پیش ہونا پڑا۔ لیکن ٹریبونل نے انہیں بری کر دیا۔

عبدالقادر کمالی، ادانہ واپس آ گئے اور 1930ء تک ایک وکیل کے طور پر اور اپنے فارم میں کام کرتے رہے، جس کے بعد وہ دوبارہ سیاست میں شامل ہو گئے۔ مصطفیٰ کمال کے ایک قریبی ساتھی فاتحی (اوکیار) نے صدر کی جانب سے حوصلہ افزائی پاتے ہوئے جو کہ ایک وفادار حزبِ مخالف کا وجود چاہتے تھے ایک اپوزیشن پارٹی قائم کی۔ اس کا نام فری ری پبلیکن پارٹی (Serbest Cumhuriyet Fırkası) رکھا گیا۔ عبدالقادر کمالی نے ایک مرتبہ پھر سیاسی میدان میں داخل ہونے کا فیصلہ کیا لیکن خود اپنی شرائط پر۔ 29 ستمبر 1930ء کو انہوں نے پاپولرری پبلکن پارٹی (Ahali Cumhuriyet Fırkası) کی بنیاد رکھی۔ انہوں نے "Ahali" کے نام سے ایک اخبار بھی شائع کرنا شروع کر دیا، جس میں انہوں نے دوبارہ اپنے متنازع خیالات کا پرچار شروع کر دیا، خصوصاً عوامی سرکاری اخراجات میں بہت زیادہ کٹوتی پر بات کی۔

تاہم حکام نے یہ محسوس کیا کہ ''وفادار'' مخالف ''فری ری پبلیکن پارٹی'' خطرناک حد تک مقبول ہو رہی تھی اور حکمران ری پبلکن پیپلز پارٹی (Cumhuriyet Halk Fırkası) کے اقتدار کے لیے خطرہ بنتی جا رہی تھی۔ اس حقیقت کو باور کرتے ہوئے کہ اسے مصطفیٰ کمال کا اعتماد حاصل نہیں رہا، فتحی نے 17 نومبر کو پارٹی تحلیل کر دی۔ اس عمل نے عبدالقادر کمالی کی ''پاپولرری پبلکن پارٹی'' کو توجہ کا مرکز اور حکومت کے عدم اطمینان کا باعث بنا دیا۔ خطرے کو بھانپتے ہوئے وہ فرار ہو کر شام پہنچ گئے۔

وہ ابتدائی طور پر چھے ماہ کے لیے انطا کیہ (Antakya) چلے گئے، جہاں 1931ء کے موسم گرما میں ان کی بیوی اور بچے بھی ان کے پاس پہنچ گئے، جو ترکی میں بغیر کسی مدد وسہارے کے رہ گئے تھے۔ وہ بیروت منتقل ہو گئے جہاں انہوں نے ایک ریستوران کھول لیا۔ ناول میں اورحان کمال نے بیان کیا ہے کہ کس طرح وہ اور ان کا بھائی ریستوران میں برتن دھوتے تھے اور کس طرح وہ استنبول سے تعلق رکھنے والی ایک یونانی لڑکی ایلینی کے عشق میں گرفتار ہو گئے، جس کا ذکر اس نظم میں ملتا ہے جو انہوں نے ناظم کو جیل میں سنائی تھی۔

عبدالقادر کمالی 1939ء تک جلاوطن رہے، جب انہیں معلوم ہوا کہ اب ترکی واپسی خطرناک نہیں ہے۔ اس وقت تک اورحان کمال پہلے ہی جیل میں تھے۔ اورحان کی بیوی ''باپ کا گھر'' میں پیش کیے گئے باپ کی نسبت ایک قدرے مختلف آدمی کا نقشہ پیش کرتی ہیں:

''میرے سسر عبدالقادر کمالی بے ایک بہت دانش مند، تجربہ کار انسان تھے۔ وہ اپنے بیٹے کی سزایابی پر کبھی گھبراتے نہ تھے۔ اپنے دوستوں کے ذریعے انہوں نے رشید کو قیصریہ سے ادانہ جیل منتقل کروایا۔ لیکن انہوں نے باور کیا کہ اس وجہ سے علاقے کے جنونیوں میں اشتعال پیدا ہو گیا ہے۔ وہ ہمارے گھر پر پتھر برسا رہے تھے اور ہمارے سروں پر پتھروں کی بارش کرنے کے لیے چھکڑوں پر چڑھ رہے تھے۔ صورت حال خراب ہو رہی تھی، لہٰذا انہوں نے رشید کو بورصہ منتقل کروا دیا۔''

جیل سے رہائی کے دو سال بعد اورحان کو جبری فوجی خدمات انجام دینے کے لیے بلا لیا گیا۔ تاہم جب انہوں نے یہ مکمل کر لی تو انہیں فارغ نہ کیا گیا بلکہ انقرہ کے شمال میں واقع چورم (Çorum) کے علاقے میں جلاوطن کر دیا گیا۔ اُن کے والد نے وزیر اعظم کو لکھا اور اورحان کو رہائی نصیب ہوئی۔

عبدالقادر کمالی نے اپنی بقیہ زندگی کا بیشتر حصہ ادانہ کے قرب وجوار میں وکیل کے طور پر کام کرتے ہوئے بسر کیا۔ وہ 1949ء میں انقرہ کے ایک ہسپتال میں وفات پا گئے۔

تاہم عبدالقادر کمالی بے کے بارے میں آخری الفاظ ناظم حکمت نے تحریر کیے جنہوں

نے انہیں اپنی رزمیہ نظم "Ü lkem İnsan ` Manzaraları" (میرے وطن سے انسانی مناظر) میں شامل کیا۔ اس نظم میں انہیں ''شیو کی بے'' کے کردار کی صورت میں ہیں:

پہلی ''گرینڈ نیشنل اسمبلی'' میں---

یہ برسوں پہلے کی بات ہے۔

شیو کی بے اپنے تومند وجود کے ساتھ ایستادہ کھڑا ہوتا

وہ اپنا دایاں ہاتھ سامنے پھیلا لیتا

اور اپنی ہر تقریر کا اختتام

بجائے قرآنی آیت کے

اس شعر پر کرتا

''انسانیت کے نام پر، یقین محکم اور ضمیر کے نام پر

جدوجہد آزادی کے لیے بہائے گئے خون کے نام پر.....''

وہ دھڑے بندیوں سے آزاد، اپنی ذات میں ''حزب مخالف'' تھا۔ گروپوں سے باہر۔

وہ اس قدر بے خوف تھا کہ اس نے ''لنگڑے عثمان'' کو بھی ششدر کر دیا

انہوں نے اسے دوسرے عام چناؤ میں کھڑے نہ ہونے دیا۔

وہ اپنے حق کے لیے لڑا،

اسے انڈی پینڈنس ٹریبونل کے سامنے پیش کیا گیا،

وہ جیل سے باہر آیا۔

وہ ملک سے باہر رہتے ہوئے اپنی جدوجہد جاری رکھنے کے لیے حلب فرار ہو گیا،

اور شاید وہ اب اتنا بے خوف نہیں تھا کہ لنگڑے عثمان کو مزید ششدر کر سکتا،

شاید اس کے فرار میں بلیک میل کا کوئی شائبہ ہو۔

اس کا سارا خاندان حلب میں بھوکا رہا

اور شیو کی بے

اپنے من میں ایسے ہیرو کی لاش سموئے

جسے لوگ صحیح طور پر سمجھ نہ پائے تھے،

اس حسن ظن کے ساتھ

کہ یہ لاش بھی انہیں خوف زدہ کر سکتی ہے

اور اپنی بغل میں پروٹسٹنٹ قرآن لیے ہوئے

حلب سے واپس وطن لوٹا

شیو کی بے

اپنے گھر پر طلسماتی کہانیوں کے بغدادی خلیفاؤں کی طرح حکم چلاتا ہے:

اپنے مخصوص، منفرد ترحم

اپنے بے رحم انصاف

اپنی ناقابل یقین کنجوسی اور

دریا دلی کے ساتھ.....

شاعری سے ناول نگاری تک

"چکروا (Çukurova) ایک زرخیز قطعہ زمین ہے، جو
ایسے واقعات سے گزر چکا ہے جن کی باز گشت اسے
آج بھی دلچسپیوں کا حامل بنائے ہوئے ہے۔ یہ تضادات
سے بھرا ایک علاقہ ہے جس نے ایک ناول نگار کو پروان
چڑھایا۔ ایک ایسی جگہ ہے جہاں ترک صنعت کاری
کی اوّلین کونپلیں پھوٹیں۔ یہ چکروا ہی تھا جہاں
ہمارے وطن کی مٹی میں پہلی مشین داخل ہوئی۔
اورحان کمال کا خاندان بھی نقل مکانی کر کے آنے والے
خاندانوں میں سے ایک تھا، جنھوں نے چکروا کا رخ
کیا۔"

یشار کمال

چکروا، جنوب مشرقی ترکی میں ادانہ شہر کے اردگرد ایک زرخیز سلیشائی میدان ہے، جو
بیسویں صدی کے وسط سے ملک کی کپاس کی پیداوار کا مرکز بننے والا تھا۔ عبدالقادر کمالی ہے، چکروا

میں پیدا ہوئے اور یہیں پلے بڑھے۔ ادانہ کے مشرق میں ایک چھوٹے سے قصبے جیہان میں 15 ستمبر 1914ء ان کا بیٹا اورحان کمال پیدا ہوا (جو اپنے دوستوں اور خاندان میں ''رشید'' کے نام سے جانے جاتے ہیں)۔ ان کے دادا نے عبدالقادر کمالی کو درۂ دانیال ایک ٹیلی گرام بھیجا جو کہ نومولود بچے کے نام سے تھا۔

''میں اس دنیا کی مصیبتیں جھیلنے کے لیے اس دنیا میں آ گیا ہوں۔''

محمت رشید

عبدالقادر کمالی کا خاندان چکروا میں ایک باحیثیت خاندان تھا اور وہ زندگی بھر اپنی وکالت، سرکاری ملازمتوں اور جلاوطنی کے دوران ملنے والے فرصت کے اوقات میں یہاں آتے رہے۔ ان کے والد جیہان میں ایک چھوٹے حکومتی عہدے دار تھے۔ تاہم اصل میں خاندان مشرقی اناطولیہ کے علاقے ایلازے کے ایک گاؤں سے نقل مکانی کر کے یہاں آیا تھا۔

اورحان کمال کی والدہ عظیمہ خانم کا تعلق چکروا کے علاقے سے تھا۔ اس دور کی عام خواتین کے برعکس، انہوں نے ثانوی سطح تک تعلیم حاصل کی تھی اور پرائمری سکول ٹیچر کی حیثیت سے دو سال تک خدمات بھی انجام دیتی رہیں۔ وہ ایک باتونی، ملنسار، گرم جوش شخصیت کی مالک، اچھی حس مزاح رکھنے والی خاتون تھیں۔ شاید ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ ایک عمدہ داستان گو اور اچھی یادداشت کی مالک بھی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ عظیمہ خانم اور ان کے بیٹے کے درمیان بہت زیادہ جسمانی مشابہت پائی جاتی تھی۔

ادانہ اور اس کے اردگرد کے علاقے پر 1918ء میں فرانس کا قبضہ تھا۔ اس دور میں یہ خاندان اناطولیہ کے اردگرد بہت سے قصبوں اور شہروں میں گھومتا رہا اور آخرکار انقرہ پہنچ گیا، جہاں عبدالقادر کمالی پہلی گرینڈ نیشنل اسمبلی کے 1923ء تک ممبر رہے تھے۔ اورحان کمال، انقرہ میں بسر کیے گئے برسوں کے بارے میں اپنے بچپن کے تاثرات بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''......اور پھر انقرہ......!

جب کوئی انقرہ کا نام لیتا ہے تو مجھے جلی ہوئی اور گلی سڑی لکڑیوں اور مٹی کی اینٹوں کے ڈھیر کے درمیان ایک دوسرے کے اوپر بنے ہوئے مکان، Kalpaks (جنگ آزادی میں

ترک قوم پرستوں کی مخصوص ٹوپی) پہنے ہوئے سپاہی اور افسر، اور حاکمیتِ ملیہ (Hakimyet-i-Milliye)اخبار بیچتے ہوئے بچے یاد آتے ہیں۔"

1923ء کے عام انتخابات کے بعد جب عبدالقادر کمالی کی اسمبلی رکنیت ختم ہوگئی تو وہ اور ان کا خاندان ادانہ واپس آ گیا۔ تاہم انہوں نے اپنی سیاسی سرگرمیاں جاری رکھیں، جب کہ اورحان دنیا سے بےخبر فٹ بال کھیلنے اور اردگرد کے دیہاتی ماحول سے لطف اندوز ہونے میں مگن تھے۔ والدین خاص طور پر والد کی جانب سے پابندیوں کے باوجود یہ ایک خوش باش بچپن تھا اور خاندان کسی چیز کا محتاج نہ تھا۔

یہ صورتِ حال اس وقت اچانک ختم ہوگئی جب ان کے والد نے جلاوطنی اختیار کر لی۔ خاندان کے پاس سہارے کا کوئی ذریعہ نہ رہ گیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ اورحان کو مکمل آزادی مل گئی تھی، لیکن چھ ماہ بعد خاندان جلاوطن عبدالقادر کمالی کے پاس پہنچ گیا۔

وہ وقت جوان کے خاندان نے جلاوطنی کے دوران بیروت میں گزارا، اس کا ذکر ہمیں اورحان کے پہلے نیم خودنوشتہ ناول "باپ کا گھر" میں نمایاں طور پر ملتا ہے۔ ترکی میں بسر کی گئی خوش حال زندگی کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ اورحان کو حقیقی غربت کا تجربہ ہوا۔ یہاں روزی کمانے کی جس فکر نے انہیں گھیرا وہ ساری عمر اُن کا پیچھا کرتی رہی۔ بیروت ہی میں وہ پہلی مرتبہ ایک یونانی لڑکی ایلینی کی محبت میں گرفتار ہوئے اور اس وقت ٹوٹ پھوٹ کر رہ گئے جب اسے اور اس کے خاندان کو اچانک لبنان سے نکال دیا گیا۔

1932ء میں اورحان نے اپنے والد کی خواہشات کے برعکس اپنے طور پر ادانہ واپس جانے کا فیصلہ کیا۔ ترکی میں واپس آ کر اپنی تعلیم جاری رکھنے کے خیال سے وہ اپنی دادی کے پاس ٹھہرے اور چند ماہ بعد ان کی والدہ اور بہن بھی ان کے پاس آ گئیں۔ اب وہ مکمل طور پر اپنے مالک آپ تھے۔ فٹ بال میں ان کی دلچسپی بہت زیادہ بڑھ گئی اور انہوں نے سکول چھوڑ دیا تاکہ فٹ بال کو زیادہ وقت دے سکیں۔ وہ بہت اچھا کھیلتے تھے اور ان کی مقامی ٹیم کی جیت کی امیدیں ان سے وابستہ تھیں۔ جسمانی کھیلوں میں کھلاڑیوں کی کارکردگی میں اضافے کے لیے توانائی سے بھرپور غذا کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن اورحان کمال اور ان کے دوست اکثر اوقات تقریباً خالی

پیٹ ہی فٹ بال کھیلا کرتے تھے۔

یہ وقت ان کی والدہ کے لیے بہت زیادہ مشکل تھا۔ ان کی کوئی آمدنی نہ تھی، دوست اور رشتہ دار جن کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ وہ ان کی مدد کریں گے، اُس آدمی کے خاندان سے دُور رہنا پسند کرتے تھے جو جمہوریہ کے بانیوں اور ان کی پالیسیوں کی نفی کرتا اور ان پر تنقید کرتا تھا۔ کچھ تو عبدالقادر کمالی کے موقف سے حقیقی اختلاف رکھتے تھے اور کچھ لاتعلق تھے کہ کہیں وہ بھی اسی رنگ میں نہ رنگے جائیں۔ 1935ء میں اورحان کی والدہ اور ہمشیرہ، اورحان کو چھوڑ کر واپس جلاوطنی میں ان کے والد کے پاس چلی گئیں۔ اس وقت تک عبدالقادر کمالی، بیروت سے یروشلم منتقل ہو چکے تھے، جو اس وقت برطانیہ کے زیر تسلط تھا اور وہاں وہ ایک مقامی وکیل کے ساتھ کام کر کے روزی کما رہے تھے۔

اورحان کے گھر والوں، خاص طور پر ان کی دادی کا خیال تھا کہ اورحان اگر اپنے موجودہ دوستوں کے ہجوم سے دُور رہیں تو وہ دوبارہ سکول جا کر اپنی تعلیم مکمل کر سکتے ہیں، اور یوں انہیں استنبول میں رشتہ داروں کے پاس رہنے کے لیے بھیج دیا گیا۔ تاہم اورحان کا سکول واپس جانے کا کوئی ارادہ نہ تھا اور وہ اپنے ان دوستوں کی مدد سے، جو اُن سے پہلے ادانہ سے استنبول آ چکے تھے، کوئی کام تلاش کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی مایوسی اور آنکھوں سے پردہ اٹھنے کے بعد وہ بہت جلد واپس ادانہ آ گئے۔ انہیں اپنے اس تجربے کو اپنے ناول "Bereketli Topraklar Üzerinde" (زرخیز زمینوں پر) میں استعمال کرنا تھا۔

بالکل اسی طرح جس طرح وہ بیروت میں ایلینی کو دل دے بیٹھے تھے، اورحان کمال ادانہ واپس آنے پر ایک لڑکی کے عشق میں مبتلا ہو گئے۔ لیکن استنبول میں مختصر قیام کے دوران یہ تعلقات ختم ہو گئے، جب اس لڑکی کی جس سے وہ محبت کرتے تھے، توجہ کسی اور کی جانب مبذول ہو گئی۔ قصبے کی ایک بار میں کام کرنے والی ایک بڑی عمر کی خاتون سے ان کی آشنائی اس وقت ختم ہو گئی جب اورحان بہت سنجیدہ ہو گئے اور خاتون نے فیصلہ کیا یہ ایسا تعلق نہیں ہے جسے مزید بڑھایا جائے اور وہ قصبہ چھوڑ گئی۔ ان کا یہ تجربہ ہمیں ان کے ناول "Sokaklardan Bir Kız" (گلیوں کی ایک عورت) میں نظر آتا ہے۔ ان تمام ابتلاؤں کے دوران ان کی تشفی و تسلی کا ایک ذریعہ

کتابیں تھیں۔ عالمی کلاسیکی ادب کا ترکی ترجمہ اور ترک ادیبوں کی کتابیں وغیرہ جو بھی ان کے ہاتھ لگا انہوں نے پڑھ ڈالا۔ وہ اس دوران شاعری بھی کرتے رہے۔

اس مرتبہ انہوں نے "Milli Mensuca t Fabrikası" ایک کاٹن مل، جو کپڑا اور دھاگا تیار کرتی تھی، میں بالکل بنیادی تنخواہ پر کلرک کے طور پر کام شروع کر دیا۔ یہاں ان کی ملاقات نوری سے ہوئی جو یہاں کام کرنے والی نوجوان لڑکیوں میں سے ایک تھی، اس کا خاندان پہلی عالمی جنگ کے بعد بلقان سے ہجرت کر کے یہاں آیا تھا، اس کا خاندان بھی غریب تھا اور یہاں بہت سے ایسے خوش حال نوجوان تھے جو اس سے شادی کرنا چاہتے تھے۔

لیکن یہ اور حان (یا رشید، جیسا کہ اس نے انہیں ہمیشہ پکارا گیا) تھے جنہوں نے اس کا دل جیت لیا اور ان کی صاف گوئی اور دیانت داری نے نوری کے والد کو بھی قائل کر لیا۔ 5 مارچ 1937ء کو ان کی شادی ہوگئی۔ تقریباً ایک سال کے بعد، ان کی پہلی اولاد یلدز پیدا ہونے کے فوراً بعد اورحان کو جبری فوجی خدمت کے لیے بلا لیا گیا اور چھے ماہ کے لیے مجد میں خدمات انجام دینے کے لیے بھیج دیا۔ جبری بھرتی کیے جانے والے ان کے کچھ دوسرے ساتھیوں نے ان کی مخبری کی اور اس کی ذاتی سامان وغیرہ کی تلاشی لی گئی اور جو کچھ برآمد ہوا اسے ان کے جرم کی ٹھوس شہادت قرار دیا گیا۔ چارج شیٹ 6th آرمی کور کے سٹاف آفیسر نے تیار کی جس میں ان کی مجرمانہ سرگرمیوں کا خلاصہ بیان کیا گیا تھا:

حتمی تفتیش کا فیصلہ

میں نے رشید کمالی ولد عبدالقادر کمالی 12 انفنٹری رجمنٹ جس میں بیرونی حکومتوں کی حمایت میں پروپیگنڈا کرتے ہوئے سپاہیوں کو بغاوت پر اکسانے کا الزام ہے، کے بارے میں ابتدائی تحقیق سے متعلق دستاویزات کا بغور جائزہ لیا ہے۔ رشید کے کیمونسٹ پروپیگنڈا کرنے کی اطلاع ملنے پر اس کی تلاشی لی گئی تو اس کے قبضے سے ناظم حکمت کے نام اس کے اپنے ہاتھ سے لکھی ہوئی نظمیں، میکسم گورکی کی کتاب ''روسی انقلاب کے مراحل اور قید'' اور دیگر روسی مصنفین کی زندگیوں اور مارکسزم

پر لکھے گئے مضامین کے اخباری تراشے برآمد ہوئے۔ مجدلائبریری کے کلرک یوسف اور 6th کمپنی کے عدنان، انور اور حمزہ کے شہادتی بیانات کے مطابق رشید نے کہا کہ وہ ناظم حکمت کا معترف ہے اور اس کا کام بہت اہمیت کا حامل ہے اور اسے لائبریری میں رکھنا چاہیے۔ مزید برآں نورالدین اور عابدین نے بتایا کہ رشید نے کہا کہ ہم یورپی ممالک جیسا کہ اٹلی، جرمنی اور روس حتیٰ کہ بلقان ممالک سے بھی پیچھے ہیں اور اس کے گھر سے ملنے والی دستاویزات بھی اس نوعیت کی ہیں۔ کہنے کا مطلب ہے کہ بیرونی حکومتوں کی تائید کرنا، اور ان افراد کو ایسی تعلیم دینا، اور ان نظریات کی مثالوں کے ساتھ اس طور پر وضاحت کرنا جو قومی جذبات کو مجروح کریں، اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ وہ بیرونی ممالک کی ایما پر اس قسم کے پروپیگنڈے میں مصروف ہے، اور اس کی سرگرمیاں کا فوجی حلقوں میں ارتکاب بغاوت پر اکسانے پر محمول ہیں۔ گواہان کے بیانات اور اس کے اپنے اقرار سے جس انداز میں اس نے ان کی وضاحت کی کوشش کی، اس صورتِ حال کی تصدیق ہوتی ہے۔ اس روشنی میں جیسا کہ ملزم رشید کے اقدامات پینل کوڈ کے آرٹیکل 94 کے تحت آتے ہیں، میں نے فیصلہ کیا ہے کہ حتمی تحقیق اور مقدمہ X/X/1938 پر آرمی کور ملٹری کورٹ میں اعلیٰ فوجی انتظامی عدالت کے قانون کے آرٹیکل 125 کے مطابق چلنا چاہیے۔

6th آرمی کور کمانڈر

ایم۔ ایر گودر (M. Ergüder)

یہ وہ دستاویز تھی جس کے نتیجے میں اورحان کمال کو 26 ستمبر 1943ء تک قید کی سزا سنائی گئی۔ اس سزا نے اس کے نوخیز خاندان اور خود اس پر تباہ کن اثرات مرتب کیے۔ ستم ظریفانہ طور پر یہ سخت سزا اورحان کمال کو ترکی کی ایک اہم ادبی شخصیت بنانے میں معاون ثابت ہوئی۔ حسن

اتفاق سے ناظم حکمت کو بورصہ جیل منتقل کر دیا گیا تھا جب کہ اورحان کمال ان کے وہاں پہنچتے ہی فوراً انہیں ملے۔ بعد میں یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ ان کی یہ دوستی کیسے پروان چڑھی جیسا کہ اورحان کمال نے بیان کیا ہے۔ وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے یہ کہا کہ ناظم حکمت ان کے حقیقی استاد تھے۔ لیکن انہوں نے اس کو قدرے تفصیلی انداز میں بیان کیا ہے:

''......جیسا کہ میں اپنے پورے خلوص سے بات کر رہا ہوں، ناظم حکمت میرے حقیقی استاد ہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ انہوں نے فن وثقافت کی روح کو میرے سر میں کیف رکھ کر انڈیل دیا تھا۔

ایسا نہیں تھا! کئی سال پہلے، میں تقریباً ہر موضوع پر پڑھنے کا شوقین تھا، سکول کے نصاب کے علاوہ، وہ مضامین بھی جو میری ذہنی سطح سے بلند تھے۔ اس طرح میں نے دنیا اور لوگوں کے بارے میں شاید قدرے ابتدائی لیکن ایک معقول نظریہ قائم کر رکھا تھا۔ میں کھیلنے کا بہت زیادہ شوقین تھا، لیکن جب میں گھر میں ہوتا تو مختلف موضوعات سے متعلق کتابیں پڑھتا رہتا تھا۔ میں کیوں پڑھتا تھا، میں نہیں جانتا، لیکن مسلسل پڑھتا تھا یہ ایک حقیقت ہے۔ جب میں ناظم سے ملا تو میں ایک پوری سوجھ بوجھ رکھنے والا بالغ انسان تھا۔ انہوں نے مجھے سکھایا کہ دنیا کو کیسے دیکھا جائے اور اشیاء کو ان کے مخصوص اسلوب کے ڈھانچے کے اندر کیسے دیکھا جائے۔ لوگ جو ہمارے دور میں رہ رہے ہیں، لوگ جو اپنے ارد گرد دیکھ سکتے ہیں ان کا اس دنیا سے جس میں وہ رہ رہے ہیں متاثر ہونا ناگزیر ہوتا ہے۔ اس بات کا علم ہونا کہ کیسے دیکھا جائے بہت اہم بات ہے۔ جو کچھ آپ کو دیکھنا چاہیے وہ آپ صرف اس صورت میں دیکھ سکتے ہیں جب آپ کو علم ہو کہ کیسے دیکھنا ہے۔ یہ وہ بات تھی جو ناظم نے مجھے سکھائی تھی......''

اورحان کمال نے 1930ء کی دہائی کے وسط سے چھوٹی عمر میں شاعری شروع کر دی تھی، انہوں نے بہت زیادہ لیکن بے تکے پن سے لکھا۔ وہ کہتے ہیں کہ ان کی پہلی نظم 1938ء یا 1939ء میں اس وقت شائع ہوئی تھی جب وہ قیصریہ میں واقع فوجی جیل میں تھے۔ یہ رشید کمال کے نام سے شائع ہوئی تھی۔ تاہم ایک مصنف کے طور پر ان کے تکوینی دور کا آغاز ناظم کی بورصہ جیل منتقلی سے ہوتا ہے۔ ناظم نے اپنے بورصہ پہنچنے کی اطلاع کمال طاہر کو ایک ٹیلی گرام کے ذریعے

دی جو کہ ابھی تک چانکیری جیل میں تھے۔

''بخیریت پہنچ گیا ہوں۔''

ٹیلی گرام پر 5 دسمبر 1940ء کی تاریخ درج ہے۔

اگلے دن 6 دسمبر جمعہ کے روز ناظم حکمت نے بورصہ جیل سے کمال طاہر کو پہلا خط تحریر کیا:

کمال!

میں بورصہ میں ہوں۔ بورصہ جیل کے درودیوار اور کنکریٹ کے فٹ پاتھ 1933ء سے جوں کے توں ہیں، یہ پہلے سے بدتر ہوئے ہیں اور نہ ہی ان کی کوئی تعمیر و مرمت کی گئی ہے۔ میں ایسے ایک دو قیدیوں سے ملا ہوں جو اس وقت سے یہاں ہیں۔ انہوں نے مجھے پہلے سے قدرے بوڑھا پایا ہے جیسے کہ مجھے بھی وہ ایسے ہی نظر آئے ہیں۔

میں اس جگہ کے بارے میں پہلے بھی تمہیں بتا چکا ہوں۔ یہ ہوائی جہاز کی شکل کی عمارت ہے۔ میرا کمرا اس کی دُم والے سرے پر تیسری منزل پر بائیں جانب ہے۔ یہ چانکیری میں میرے کمرے سے تھوڑا چھوٹا ہے۔ اس میں ہم دو آدمی رہتے ہیں۔ میرے ساتھی کا نام کمال ہے۔ ہاں ''کمال'' جو کہ تمہارا بھی نام ہے۔ اس کا صرف نام ہی تمہارے نام جیسا نہیں ہے بلکہ اس کی شخصیت کے بھی بہت سے پہلو ایسے ہیں جو جوانی میں تمہارے ہوا کرتے تھے۔ وہ شاعری کا بہت شوقین ہے اور پُرجوش نوجوان ہے۔ اسے آرٹیکل 94 کے تحت پانچ سال قید کی سزا ہوئی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ سوائے نام کے اس کی کوئی چیز بھی تم سے مشترک نہ ہو لیکن میں یہ مشابہت دیکھنا چاہتا ہوں، بہرحال میں اپنے ساتھی کے ساتھ خوش ہوں۔ ہم دونوں تمہاری باتیں کرتے ہیں۔ اس نے تمہاری کہانیاں پڑھ رکھی ہیں جو "Yedigün" میں شائع ہوئی تھیں۔ میں اسے تمہارے بارے میں بتاتا ہوں تو مجھے یوں محسوس ہوتا کہ تم سے باتیں کررہا ہوں۔ اور یہ تصور اس قدر شدید ہے کہ گزشتہ رات مجھے یوں لگ رہا تھا کہ دروازہ ایک جھٹکے سے کھلے گا اور تم اندر آ جاؤ گے......''

یہ ناظم اور کمال طاہر کے درمیان لمبی خط و کتابت کا آغاز تھا، جس سے ہمیں ادب، ادبی تحریروں اور جنگ کے بارے میں ناظم کے نظریات، ان کی مایوسیوں، امیدوں، اپنی بیوی

پیرائے (Piraye) کے لیے ان کی محبت اور بعد میں ان کی محبتوں کا ایک دوسری خاتون منور کی جانب مبذول ہو جانا جس سے بعد میں انہوں نے شادی بھی کر لی تھی، اپنے دوستوں کے لیے ان کے خلوص وعقیدت اور ان کی فراخ دلی کے بارے میں علم ہوتا ہے۔ ان سے ہمیں جو ایک اور اہم معلومات ملتی ہیں وہ بورصہ جیل میں اپنے نئے نوجوان دوست کے بارے میں ناظم کے اعلیٰ جذبات اور ان کے درمیان بڑھتی ہوئی قربت کا بیان خود ناظم کے اپنے الفاظ میں ملتا ہے۔ اکثر خطوط میں ہمیں اس نوجوان آدمی کا ذکر ملتا ہے خواہ یہ کمال طاہر تک اس کا سلام پہنچانے تک ہی کیوں نہ محدود ہو۔ بدقسمتی سے صرف چند ایک خطوط پر ہی ناظم نے تاریخ درج کی ہے۔ لیکن ان کی تدوین کرتے ہوئے کمال طاہر نے انہیں ایک تسلسل میں رکھا ہے۔ (واقعات کے تسلسل میں پائی جانے والی بعض خلاف بیانیوں سے پتا چلتا ہے کہ ان کی ترتیب مکمل طور پر درست نہیں ہے)۔

کمال طاہر کے نام ناظم کے دوسرے خط میں اوررحان کمال کے بارے میں درج ذیل الفاظ ملتے ہیں:

''میرا روم میٹ ایک خوش اخلاق نوجوان ہے جو کہ شاعری اور ادب میں گہری دلچسپی رکھتا ہے۔ فی الوقت ہمارا ساتھ بہت اچھا جا رہا ہے۔ وہ تمہیں سلام کہتا ہے۔''

تیسرے خط سے ہمیں پتا چلتا ہے کہ ناظم نے اپنے نوجوان روم میٹ کو اپنے ہاتھوں میں لینے اور اس کی تعلیم و تربیت کا فیصلہ کر لیا ہے:

''...... میں تمہیں بتاتا ہوں کہ آج کل میں اپنے دن کیسے گزار رہا ہوں۔ دروازہ 8 بجے کھلتا ہے۔ 9 بجے تک ہاتھ منہ دھونا، چائے بنانا اور اِدھر اُدھر گھومنا پھرنا ہوتا ہے۔ 9 بجے پڑھنے، یا برلز کے طریقہ (Berlitz Method) پر کچھ کہانیاں پڑھنے کے لیے بیٹھ جاتا ہوں تاکہ تمہارے ہم نام کی فرانسیسی زبان میں کچھ بہتری لائی جا سکے........''

دو خط جو کہ ان چند خطوط میں سے ہیں جن پر تاریخ درج ہے، زیادہ معلومات مہیا کرتے ہیں۔ 3 مارچ 1941ء کو تحریر شدہ اپنے چوتھے خط میں ناظم لکھتے ہیں:

''میں نہیں جانتا کہ تمہارا اس مختصر کہانی کے بارے میں کیا خیال ہے جو رشید کمالی نے

تمہیں بھیجی تھی۔ لیکن اب وہ ایک نئی کہانی لکھ رہا ہے۔ اگر حالات نے اجازت دی اور سب کچھ ٹھیک رہا تو میں تمہارے نقش قدم پر چلنے والا ایک اور مصنف دنیا کو متعارف کرواؤں گا۔ وہ ابھی جوان ہے اور زیادہ تجربہ کار نہیں ہے۔ اسے پہلے زبان سیکھنا ہوگی۔ وہ فرانسیسی پڑھ رہا ہے۔ اگر سب کچھ ٹھیک رہتا ہے تو دو سال کے عرصہ میں دنیا میں ایک نیا کہانی نویس جنم لے گا.....''

17 جون 1941ء کو اپنے پانچویں خط میں وہ لکھتے ہیں:

''......لیکن میں پورے خلوص سے یہ بات تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ میرے نقطہ نظر سے رشید کمال کے پاس جسمانی مشقت کرنے والوں کی تصویر کشی کا بہترین ہنر موجود ہے، جس کی تحریریں ابھی تک پوری طرح پختہ نہیں ہوئیں۔''

جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے، اورحان کمال اپنے قریبی حلقہ میں رشید کمالی کے نام سے جانے جاتے تھے۔ انہوں نے اپنی کچھ ابتدائی نظمیں اور کہانیاں اپنے نام کے ساتھ ساتھ اورحان رشید اور اورحان رشاد کے نام سے شائع کروائی تھیں۔ 1941ء میں انہیں اپنی ایک مختصر کہانی ایک ادبی جریدے "Yürüyüş" کو بھجوانے کے لیے کہا گیا۔ ایڈیٹر کو تشویش تھی کہ نوجوان مصنف کسی مصیبت سے دو چار ہو سکتا ہے اور اس نے یہ کہانی اورحان کمال کے نام سے شائع کی۔ مصنف کو یہ نام جو اس کے لیے منتخب کیا گیا تھا بہت پسند آیا اور اس دن کے بعد انہوں نے اپنی تمام تحریریں اسی نام سے لکھنا شروع کر دیں۔ ان مختلف ناموں سے شائع ہونے والی تحریروں نے کسی حد تک الجھاؤ کو بھی ختم کر دیا تھا۔ انہوں نے جب اورحان کمال کا نام استعمال کرنا شروع کیا تو اس کے فوراً بعد ناظم کو صباح الدین علی کا ایک خط موصول ہوا جس میں انہوں نے ادبی منظر پر ایک نئے مصنف کے ظہور پر مسرت کا اظہار کیا تھا: ''حال ہی میں ہم نے وہ مختصر کہانیاں پڑھی ہیں جو ایک باصلاحیت مصنف اورحان کمال نے لکھی ہیں۔ کیا آپ اسے جانتے ہیں؟ کیا آپ نے اس کے بارے میں کبھی سنا ہے؟ مجھے اس کی کہانی "Bir Ölüye Dair" (ایک نعش کے بارے میں) بہت زیادہ پسند آئی ہے۔ اس خط نے دونوں روم میٹ قیدیوں کے درمیان ایک خوش دلی اور مسرت کو جنم دیا۔ صباح الدین علی کو آخر کار علم ہو گیا کہ رشید کمال، اورحان رشید اور اورحان کمال ایک ہی آدمی کے نام ہیں، اور دونوں مصنفین کے درمیان خط و کتابت کا سلسلہ

شروع ہو گیا۔ صباح الدین علی، اور حان کمال پر زور ڈالتے تھے کہ وہ شاعری کو چھوڑ کر صرف نثر پر توجہ دیں۔ لیکن شاعری اور حان کی پہلی چاہت تھی اور اسے ترک کرنے میں انہیں کچھ وقت لگا۔

کمال طاہر کے نام 25 ستمبر 1941ء کے اپنے خط میں ناظم تسلیم کرتے ہیں کہ اس محدود سی جگہ جہاں وہ اور اورحان کمال رہ رہے تھے، چھوٹی موٹی ناراضیاں پیدا ہوتی رہتی ہیں، لیکن دوستی میں وہی گرم جوشی اب بھی موجود ہے جو آغاز میں تھی۔

''ہر روز رشید کمال کے بارے میں میری طمانیت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ وہ غصہ دلانے والی حرکات نہیں کرتا، وہ ایسا کرتا رہتا ہے......''

''اورحان رشید کا کام کے لیے باہر جانا اس کی تحریروں اور اس کے کردار کی تعمیر دونوں کے لیے بہت مفید ثابت ہوا ہے۔ اگر چہ وہ گاہے بہ گاہے ایسی حرکات کرتا ہے جو میرے خون کو کھولا دیتی ہیں، بالکل جیسے تم کیا کرتے تھے، لیکن مختلف وجوہات کی بنا پر میں اس کی دوستی، اس کے کام اور اس کی صلاحیتوں پر بہت خوش ہوں۔''

''......میں کمال سے بہت خوش ہوں۔ سب کچھ باوجود اس کی فرانسیسی میں بہتری آ رہی ہے۔ وہ کچھ تحریروں پر کام کر رہا ہے اور وہ بہت تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ مجھے اس پر مکمل اعتماد ہے۔ ایک سال میں اس نے جو فاصلہ طے کیا ہے وہ اتنا زیادہ ہے کہ صرف پانچ سال میں طے کیا جا سکتا تھا.........''

پھر ہمیں ایک دلچسپ بات پڑھنے کو ملتی ہے:

''......تمہارے لیے ایک دلچسپ خبر ہے۔ رشید کمال نے مجھے ایک خرگوش تحفے میں لا کر دیا ہے۔ اس کا نام ''مرجان'' ہے۔ وہ پورے کا پورا دودھ کی طرح سفید ہے۔ وہ بہت زیادہ ہوشیار اور چالاک ہے اور انسانوں کا ساتھ پسند کرتا ہے۔ میں نے اسے بیٹے کے طور پر اپنا لیا ہے۔ ابھی تک وہ بہت چھوٹا ہے، لیکن جب وہ کچھ بڑا ہو گا تو ہم اس کے لیے ایک وفادار بیوی تلاش کریں گے۔''

اورحان کمال اپنی یادداشتوں کے آخر میں بیان کرتے ہیں کہ کس طرح وہ ناظم کو تحفہ دینے کے لیے خرگوش لائے اور ناظم نے کیسی ہلچل مچائی جو کہ ساتھی قیدیوں کے لیے مسرت کا

باعث بنی لیکن بعض اوقات دوسروں کے لیے بیزاری بھی پیدا کی۔ اس نے یقیناً کچھ عرصہ کے لیے ناظم کو کافی مشغول رکھا، جیسا کہ ہمیں کمال طاہر کے نام ان کے خطوط میں جا بجا اس خرگوش کا ذکر ملتا ہے:

''ہمارا بیٹا مرجان خرگوش تمہاری بلی ''مہ پس'' (قیدی) کو سلام عرض کرتا ہے۔''

لیکن شاید کسی بہتری کے مدنظر ''مرجان'' کو بہ حفاظت جیل سے نکال دیا گیا:

''میں مرجان کو تمہاری مہ پس خانم کا سلام نہیں پہنچا سکتا، جیسا کہ میں نے اسے استنبول میں پیرائے کی ماں کے پاس بھجوادیا ہے۔''

ہمیں معلوم ہوا کہ اورحان کمال کے بورصہ جیل چھوڑنے کے تھوڑے عرصے بعد ناظم نے جیل کی اپنی کوٹھڑی میں گانے والی زرد چڑیا (Canary) پال لی تھی۔ ناظم جانوروں کے بہت شوقین تھے جس کی وجہ شاید جیل بھی ہو سکتی ہے۔

انہوں نے کمال طاہر کو اس گانے والی زرد چڑیا کے بارے میں لکھا:

''مجھے یاد نہیں کہ شاید میں نے پہلے بھی تمہیں اس بارے میں لکھا ہے یا نہیں، میرے پاس گانے والی ایک زرد چڑیا ہے۔ وہ یہاں ایک ٹوٹے ہوئے پنجرے میں پیدا ہوئی اور اب وہ تین ماہ کی ہو چکی ہے۔ وہ چمک دار زرد رنگ کی ہے۔ اس کی ماں نے اس کا نام میمور رکھا ہے۔ وہ انتہائی شیطان اور خوش ادا ہے اور بڑے خوب صورت نغمے الاپتی اور چہچہاتی ہے۔ اب وہ اپنے پنجرے میں اپنے نیلے پتھر کی ڈوریوں کو چونچیں مار رہی ہے (پرندے یا جانور کے پنجرے میں نیلے رنگ کا منکا لٹکا دیا جاتا ہے تاکہ یہ نظر بد سے بچا رہے)۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ مجھے بھی دیکھے جا رہی ہے اور اپنے کانوں کو ٹائپ رائٹر کی آواز پر لگائے ہوئے ہے۔ اب کسی بھی لمحے وہ گانا شروع کر سکتی ہے۔ اس وقت وہ اپنے غسل والے ٹب کے کنارے بیٹھی ہے۔''

ناظم کو اس پرندے سے اس قدر لگاؤ تھا کہ ایک دوسرے موقع پر انہوں نے کمال طاہر کو ایک مختصر سی نظم بھیجی جو کہ انہوں نے اس پرندے کے بارے میں لکھی تھی۔

''میری پیاری چڑیا،

ہم دونوں کے درمیان محض ایک فرق ہے

تم پروں کے ساتھ ایک چڑیا ہو جو سوچ نہیں سکتی
میں ہاتھوں کے ساتھ ایک انسان ہوں جو سوچ سکتا ہے۔"

(ناظم حکمت کے والا نورالدین اور ان کی اہلیہ مظاہر کے نام دکھ درد میں بھی اس چڑیا کا ذکر ملتا ہے۔"رات کے 2 بج چکے ہیں۔ میری میمو اپنے پنجرے میں سوئی ہوئی ہے، میں اپنے پنجرے میں بے خواب پڑا ہوں۔")

تاہم اپنی کوٹھڑی میں چڑیا کے ساتھ سے پہلے اُن دنوں میں جب ان کا روم میٹ اور حان ابھی ان کے ساتھ ہی تھا، ناظم ان افسردہ کن ایام کے بارے میں سوچتے تھے جب ان کا نوجوان دوست رہا ہو جائے گا۔

"رشید کمالی کے اپنی پانچ سالہ قید مکمل کرنے میں صرف دس ماہ باقی رہ گئے ہیں۔ میں بہت خوش ہوں کہ میری یہاں اس سے ملاقات ہوئی۔ اس کے حوالے سے اپنا فرض ادا کرنے پر میرا ضمیر مطمئن ہے۔"

جیسے جیسے ان کی رہائی کا وقت قریب آ رہا تھا، یوں نظر آتا ہے کہ دونوں ان آخری ایام سے جس قدر ممکن ہو سکے فائدہ حاصل کرنا چاہتے تھے۔

"رشید کمالی آخری شخص ہوگا اور ایک انسان کی صورت میں آخری ماحصل ہوگا، جس پر میں نے کام کیا ہوگا اور جس کو پروان چڑھانے میں مَیں نے حصہ ڈالا ہوگا۔ آج کے دن تک میری اس قسم کی کاوشوں میں تم میری سب سے بڑی کامیابی ہو۔ تم تصور بھی نہیں کر سکتے کہ میں اسے تم جیسا بنتے ہوئے دیکھ کر کس قدر خوش ہوں گا۔ یہی وجہ ہے کہ میں اس کی شاعری پر تمہاری مختصر کہانیوں کی طرح خاص توجہ دے رہا ہوں۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ شاعری ایک ایسا جذبہ ہے جس سے میں زیادہ مانوس ہوں اور اس لیے بھی کہ رشید نے نسبتاً کم وقت میں بہت زیادہ ترقی کی ہے۔ جب میں نے اس کی ذمہ داری سنبھالی تو رشید قدرے کم تعلیم یافتہ اور کم تربیت یافتہ تھا، اس لیے تمہاری طرح زیادہ مستعد نہیں تھا۔ وہ Yeni Mecmua (نیا مجموعہ) کے شاعروں میں سے ایک تھا۔ پھر اس نے انداز کے حوالے سے کافی اصلاح حاصل کی۔ لیکن شاعری میں وہ جن تبدیلیوں سے گزرا ہے اُن کی نسبت مواد یا خیال کے حوالے سے بالیدگی کے حصول میں اس کی

رفتار قدرے سست رہی ہے۔ وجہ صاف ظاہر ہے۔ لہٰذا وہ اپنی کوئی رائے یا خیال قائم کرنے کے قابل نہیں ہو سکا، لیکن وہ ہوگا، مجھے اس بات کا یقین ہے۔ اس وقت وہ تیز اور فوری بالیدگی کے اثرات سے گزر رہا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ کس اثر کے تحت وہ یہ تمام نظمیں بشمول اس کے جسے تم نے خاص طور پر پسند کیا ہے لکھتا رہا ہے (وہ نقالی بھی کرتا ہے لیکن اس کا یہ عمل شعوری نہیں)، لہٰذا میں اس کے کام کو ابھی تک ناپختہ خیال کرتا ہوں۔ وہ اور میں اس تمام معاملے پر بات چیت کرتے رہتے ہیں۔ جو کچھ میں اب لکھ رہا ہوں وہ یہ بھی پڑھے گا۔ شاعری، یہ ذریعہ جسے ہم سب استعمال کر رہے ہیں، اس قدر خطرناک ہتھیار ہے کہ وہ لوگ جو اسے استعمال کرتے ہیں انہیں ''نوخیز شاعر'' ہونے سے آگے نکلنا ہوگا، انہیں ایک دوسرے بلند مقام تک رسائی حاصل کرنی چاہیے۔ کوئی بھی شخص ایک درمیانے درجے کے کہانی نویس یا ناول نگار ہونے کے الزام سے تو بچ سکتا ہے لیکن ایک شاعر یا تو شاعر ہوتا ہے یا پھر نہیں۔ شاید میں غلط ہوں، شاید یہ اس کام کے ذریعے اپنی اہمیت کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کی علامت ہے، لیکن میری یہی سوچ ہے اور یہی وجہ ہے کہ میں رشید کی شاعری کے بارے میں اس قدر استثنائی رویہ رکھتا ہوں۔''

تاہم کچھ رکاوٹیں بھی موجود ہیں:

''تمہارے لیے ایک بری خبر؛ تمہارا ہم نام فرانسیسی زبان کو اس طور پر نہیں پڑھ رہا جیسا کہ اس کی ضرورت ہے، یعنی وہ اسے فرض سمجھ کر نہیں پڑھ رہا۔ اور اسے ایک ایسی رکاوٹ کے طور پر نہیں لے رہا ہے جسے عبور کرنا ضروری ہے۔ میں فرانسیسی کے معاملے میں تمہارے ہم نام کی محض رسمی انداز میں شکایت کر رہا ہوں، لیکن مجھے اس سے اور کوئی شکایت نہیں ہے۔ قید کے دنوں میں جو ہم نے اکٹھے گزارے ہیں مجھے اس کی جانب سے صرف دوستی اور تعاون حاصل ہوا ہے۔''

تاہم کام کی رفتار دوبارہ تیز ہوگئی:

''رشید جنونی انداز میں کام کر رہا ہے۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ اس پر میرے اعتماد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ لیکن میں اس کے بارے خوف زدہ بھی رہتا ہوں، اس لیے نہیں کہ اس میں کوئی اہلیت یا قابلیت نہیں بلکہ اس لیے کہ اس کی قوتِ ارادی، اس کے عزم میں کمی آ سکتی ہے۔ اگر وہ اپنے ارادے اور مستقل مزاجی کو استعمال کر سکتا ہے تو پھر کوئی مسئلہ نہیں۔ اس کا راستہ سامنے

کھلا پڑا ہے۔اس کے جیل سے رہا ہونے میں پورے دو ماہ رہ گئے ہیں۔

میں نے وہ خط پڑھا ہے جو رشید نے تمہیں لکھا تھا، وہ بہت خوب صورت لکھتا ہے۔ آج تک میں نے جتنے خط پڑھے ہیں تم بہترین خط لکھنے والے ہو، اور اب تمہارے ہم نام نے اپنے اس خط کے ذریعے اپنی صلاحیت کا مظاہرہ کیا ہے۔تم سب کے درمیان خط لکھنے کے ہنر سے میں سب سے کم آشنا ہوں۔لیکن ہم کیا کر سکتے ہیں؟

رشید جلد رہا ہو رہا ہے۔فطری طور پر میں بہت خوش ہوں، حقیقتاً بہت زیادہ خوش، لیکن جدائی کی کسک پہلے ہی میرے دل میں اتر چکی ہے۔ مجھے اس سے ایک انسان، ایک دوست یا ایک ساتھی کی حیثیت سے کوئی شکایت نہیں۔اب مجھے بہت اچھی طرح سمجھ آئی ہے کہ میں اس کے ساتھ کا کس قدر عادی ہو چکا تھا اور میں اس سے کتنا پیار کرتا تھا۔اب دوبارہ میں اور تم ہی ہوں گے۔''

ناظم نے محسوس کیا کہ ٹیکنالوجی نے اس کی کارکردگی میں اضافہ کیا ہے:

''میں تمہیں اپنے ذاتی ٹائپ رائٹر پر لکھ کر بھیج رہا ہوں۔ میں نے 1913ء کا بنا ہوا آدھے ٹن وزن کا ایک ٹائپ رائٹر قرض پر خریدا تھا۔وزارتِ تعلیم مُصر تھی کہ ٹالسٹائی کے ''وار اینڈ پیس'' کا ترجمہ ٹائپ کر کے جمع کروایا جائے، اور اسی وجہ سے مجھے یہ خریدنا پڑا۔لیکن میں اس کے ساتھ خوش ہوں، اور اگر میں اس کی قیمت ادا نہ کر سکا تو میں اسے چند لیرے کم قیمت پر بیچ کر اپنی عزت بچا سکتا ہوں۔

ٹائپ رائٹرز پر لکھنے کا موقع حاصل ہونا بہت اچھی بات ہے۔صرف یہ ایک پیداواری ہتھیار ہے جو کہ میں اس دنیا میں اپنے پاس رکھنا گوارا کر سکتا ہوں۔''

وقت گزرتا جاتا ہے اور ناظم، اورحان کے بارے میں ہلکی سی تشویش کا اظہار کرتے ہیں:

''رشید آج دن شمار کر رہا تھا۔اس کی رہائی میں ٹھیک 136 دن رہ گئے ہیں۔136 دنوں بعد ایک اتوار کی صبح وہ ایک پرندے کی مانند اڑ جائے گا۔وہ تمہیں سلام بھجوا رہا ہے۔وہ آج نہیں لکھ سکتا کیوں کہ وہ بہت زیادہ مصروف ہے۔میں سوچتا ہوں کہ اس کی گزشتہ برسوں کی عادت و

اطوار کے پیش نظر جیل میں ہمارے اکٹھے گزارے گئے وقت نے کیا اثرات مرتب کیے ہوں گے۔ لیکن میں لوگوں کے بارے میں ہمیشہ پر امید رہا ہوں۔

رشید جلد ہی آزاد ہو جائے گا۔ ظاہر ہے میں بہت خوش ہوں، بہت زیادہ۔ لیکن میں جدائی کی کسک کو ابھی سے محسوس کر رہا ہوں۔ مجھے ایک انسان، ایک دوست اور ایک ساتھی کی حیثیت سے اس سے کوئی شکایت نہیں۔ اب مجھے قدرے زیادہ بہتر طور پر معلوم ہوا ہے کہ میں اس کا کس حد تک عادی ہو چکا ہوں اور میں اسے کتنا پسند کرتا ہوں، تم اور میں دوبارہ اکیلے رہ گئے ہیں۔''

کچھ وقت ایسے بھی آئے جب ناظم کی زبردست قوتِ برداشت اور تحمل کو آزمایا گیا:

''میں تمہیں ایک دلچسپ بات بتاتا ہوں۔ انقرہ میں دو جاسوس ہیں، ایک ہنگری کا باشندہ ہے اور دوسرا جرمن ہے۔ ان دونوں کو پندرہ پندرہ سال قید کی سزا سنائی گئی ہے۔ لیکن وہ اپنی قید انقرہ کی ایک ڈسٹرکٹ میں ایک مکان میں کاٹ رہے ہیں جو انہوں نے کرایہ پر لے رکھا ہے۔ وہ ایک نجی گھر ہے جس کا باغ بھی ہے، ایک وارڈر اور سپاہی کے ہمراہ یہ اپنے خاندان اور دوستوں کے ساتھ رہ رہے ہیں۔ کیسا شان دار ملک ہے، جاسوس اپنی سزائیں باغیچوں والے گھروں میں کاٹ رہے ہیں، اور ہم جو سب سے بڑھ کر ملک سے محبت رکھتے ہیں، ایک جیل سے دوسری جیل میں دھکیلے جا رہے ہیں۔''

اب اور حان کمال کی رہائی میں چند دن رہ گئے تھے:

''رشید چار روز بعد رہا ہو جائے گا۔ میرا دل جدائی کے درد سے بھرا ہوا ہے، اللہ کرے کہ وہ خوش رہے۔''

اور آخر کار وہ دن آ گیا:

''رشید جا چکا ہے، اللہ اسے خوش رکھے.....

..... رشید اپنے پیچھے ایک بہت بڑا خلا چھوڑ گیا ہے۔ اپنے نوجوان دوستوں میں تمہارے بعد میں اسے سب سے زیادہ پسند کرتا ہوں۔

رشید کے جانے کے بعد میں یہاں بہت تنہا رہ گیا ہوں۔ تحریر و تصنیف، مصوری اور

مطالعے میں دن تیزی سے گزر رہے ہیں۔لیکن کچھ ایسے مواقع بھی آتے ہیں کہ میں پورا ہفتہ کسی سے ملاقات نہیں کرتا۔''

اور اس دوران ناظم کے لیے خط و کتابت کا ایک نیا راستہ کھل گیا:

''مجھے رشید کا پہلا خط موصول ہوا ہے۔اس نے تمہیں بہت سلام عرض کیا ہے۔''

بورصہ جیل سے رہائی کے بعد اورحان کمال واپس ادانہ چلے گئے،لیکن ان کے لیے کام تلاش کرنا مشکل تھا۔ایک ایسے آدمی کو ملازم رکھنے میں جس نے پانچ سال جیل میں بسر کیے ہوں لوگ پس و پیش سے کام لیتے تھے۔انہوں نے چند ماہ مزدور کے طور پر کام کیا۔1944ء میں ان کا بیٹا ناظم پیدا ہوا۔جب ملاتیا میں ان کے ایک دوست نے کہا کہ یہاں ان کے لیے ملازمت تلاش کرنا ممکن ہے تو اورحان کمال اپنی بچی کھچی اشیاء فروخت کر کے خاندان سمیت وہاں منتقل ہو گئے۔لیکن ان کی بدقسمتی ختم نہیں ہوئی تھی۔فیکٹری جس میں ان کی ملازمت کا بندوبست کیا گیا تھا، انہوں نے ان سے فوج برخاستگی کے کاغذات طلب کیے،جو کہ انہیں ملے ہی نہیں تھے کیوں کہ قید کی وجہ سے وہ اپنی فوجی خدمات پوری نہیں کر سکے تھے۔خاندان واپس ادانہ آ گیا۔1945ء میں انہیں فوج میں واپس بلایا گیا اور انہوں نے اپنے باقی رہ جانے والے چالیس دن پورے کیے۔ خاندان کی مالی ضروریات پوری کرنے کے لیے اورحان مختلف چھوٹے چھوٹے کام کرتے رہے، مصنف کے طور پر ان کے کیریئر کا آغاز ہونا شروع ہو چکا تھا۔مشہور رسالوں میں ان کی مختصر کہانیاں شائع ہونا شروع ہو گئی تھیں اور مختصر کہانیوں کے منتخب مجموعے بھی شائع ہونے لگے تھے، اب بھی وہ اِدھر اُدھر متفرق نظمیں شائع کرواتے رہے تھے۔

ان کے آپ بیتی پر مبنی ناول ''باپ کا گھر''(Baba Evi) اور مختصر کہانیوں کا مجموعہ "Ekmek Kavgası" (جھگڑا روٹی کا) 1949ء میں شائع ہوئے۔ان کے بعد 1950ء میں ''بیکار کے مہ وسال''(Avare Yıllar) منظر عام پر آیا۔(''باپ کا گھر'' اور ''بیکار کے مہ وسال'' کے اردو تراجم جمہوری پبلیکیشنز سے شائع ہو چکے ہیں)۔یہ وہ سال بھی تھا جب ترکی کی کثیر الجماعتی جمہوریت جو کہ 1946ء میں متعارف کروائی گئی تھی، نے حقیقتاً کام شروع کر دیا تھا۔اورحان کمال ایسی تنظیموں میں جنہیں آج کل غیر حکومتی تنظیمیں (این جی اوز) کہا جاتا ہے، بہت سی کلرکی

ملازمتیں کرتے رہے تھے۔ 1950ء میں ایسی جگہوں پر ملازمتیں صرف ان لوگوں کو دی جانے لگی تھیں جو نئی حکومت کے حامی تھے۔ اور حان کمال دوبارہ اپنی آمدنی کا معمولی سا ذریعہ کھو بیٹھے۔ ان کے والد عبدالقادر کمالی بے 1949ء میں وفات پا چکے تھے۔ اب اورحان کے لیے ادانہ میں ٹھہرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ اور وہ بڑی شدت سے استنبول میں مصنف کے طور پر اپنی قسمت آزمانا چاہتے تھے، جہاں وہ شہر میں ہونے والی علمی سرگرمیوں کے زیادہ قریب ہو سکتے تھے۔

وہ اپنے خاندان کے ہمراہ 1951ء میں ریل گاڑی کے ذریعہ استنبول پہنچے۔ ان کی کل پونجی اپنی جیب میں موجود 400 لیرے تھے۔ عارضی بندوبست کے تحت وہ اورحان کے ایک سابقہ جیل کے دوست اور اس کے خاندان کے پاس ٹھہرے ہوئے تھے۔ موسم سرما کے آغاز میں انہوں نے پرانے شہر کے ایک غریب فرانسیسی علاقے میں گولڈن ہارن (شاخ زریں) کے نزدیک ایک مکان کرائے پر لے لیا۔ ان کے پاس کوئی ایندھن نہیں تھا، اورحان بعض اوقات صبح دیر تک جاگتے رہتے تاکہ وہ کہانی مکمل کر سکیں، جو کہ دوسرے روز انہیں بیچنی ہوتی تھی۔ وہ کہانیاں بیچنے میں کامیاب ہو رہے تھے، اگرچہ یہ رقم مناسب قیمت سے بہت کم ہوتی تھی۔ اب وہ کُل وقتی مصنف بن چکے تھے اور صرف لکھ کر اپنے خاندان کی کفالت کر رہے تھے۔

اوکتائے اقبال، اورحان کمال سے اپنی پہلی ملاقات کے بارے میں بتاتے ہیں:

''وہ استنبول مستقل طور پر رہنے کے لیے آئے تھے۔ اس بڑے شہر میں رہنا بڑی کوشش اور جدوجہد کی بات تھی۔ ان کے پاس اپنے قلم کے سوا کوئی دوسرا ذریعہ معاش نہ تھا۔ ان کی کوئی ذاتی آمدنی یا تنخواہ نہیں تھی۔ بیوی اور بچوں کی کفالت کا بھی بوجھ تھا۔ انہیں لکھنا پڑتا تھا اور پھر جو لکھا ہوتا اسے بیچنا ہوتا تھا اور جو رقم حاصل ہوتی اسی سے اپنے خاندان کی خوراک اور پوشاک کا انتظام کرنا ہوتا تھا۔ مختصراً انہیں اپنے قلم کے سہارے زندہ رہنا تھا۔ اس دور میں یہ بات اتنی آسان نہ تھی۔ ادب پاروں میں ایک مخصوص نقطہ نظر کو قائم رکھنا اور آسانی کے لیے فن کو داغ دار نہ کرنا اور ساتھ ہی باب عالی پریس اور پبلشروں سے پیسے حاصل کرنا..... کوئی معمولی کام نہیں تھا۔ لیکن اورحان کمال غربا کے علاقوں میں چھوٹے چھوٹے گھروں میں رہتے ہوئے اور چھوٹے چھوٹے کافی ہاؤسوں میں وقت گزارتے ہوئے کامیاب ہو گئے تھے۔ وہ بغیر رکے لکھتے تھے، وہ

دن میں آٹھ گھنٹے اپنے میز پر بیٹھ کر لکھتے رہتے تھے اور بعد میں ٹائپ رائٹر پر انگلیاں چلاتے۔ مصنفین کی پوری نسل میں وہ واحد مصنف تھے جن کو اس قسم کی سختیاں جھیلنا پڑیں اور رکاوٹوں کو عبور کرنا پڑا۔ یہ ایک قابل تعریف جدوجہد تھی۔''

خاندان کے استنبول پہنچنے کے فوراً بعد اورحان کمال اپنی بیوی اور بچوں کو ناظم سے ملاقات کے لیے لائے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ناظم، اورحان کی بیوی سے مل رہے تھے کیوں کہ وہ اپنے خاوند سے جیل میں ملاقات کے لیے نہیں آسکی تھیں۔ اور یہ بھی پہلا موقع تھا کہ ناظم نے اورحان اور نوری کی بیٹی یلدز کو دیکھا تھا، جس کے بارے میں انہیں اس کے والد کے خطوط سے آگاہی ہوتی رہتی تھی، اور ناظم اسے دیکھے بغیر ہی اس کے بڑے شیفتہ تھے۔ دونوں خاندانوں اور ان کے دوستوں نے مل جل کر ایک اچھا دن گزارا۔ چند ہفتوں میں ناظم، روس کے لیے روانہ ہو گئے، اور دونوں دوست پھر ایک دوسرے کو کبھی نہ دیکھ سکے نہ ہی ان کے درمیان خط وکتابت کا تبادلہ ہو سکا۔ اورحان نے ناظم کی موت کی خبر 3 جون 1963ء کو ریڈیو پر سنی۔ اس خبر نے انہیں ہلا کر رکھ دیا اور کئی روز بعد وہ اس صدمے سے باہر نکل سکے۔

پچاس کے عشرے میں اورحان کمال کے ادب پارے باقاعدہ وقفوں کے ساتھ سامنے آتے رہے۔ Cemile، (جمیلہ) Murtaza، Bereketli، Topraklar Üzerinde، Grev، اور 72-Koğuş (بیرک 72 کے قیدی) بڑی تیزی سے آگے پیچھے شائع ہوئے اور مقبولیت حاصل کی۔ (''جمیلہ'' اور ''بیرک 72 کے قیدی''، جمہوری پبلیکیشنز کے تحت شائع ہو چکے ہیں)۔ ان کے ناول تقریباً بہ یک وقت اخبارات میں قسط وار اور کتابی شکل میں شائع ہوتے رہے۔ لکھنے کی یہ رفتار ان کی زندگی کے اختتام تک جاری رہی۔ جب 1970ء میں انہوں نے وفات پائی تو ان کے 28 ناول، 18 مختصر کہانیوں کے مجموعے، دو ڈرامے، یادداشتوں کی دو جلدیں اور فلمی سکرپٹ لکھنے کی تکنیک پر مضامین کی ایک کتاب شائع ہو چکی تھیں۔ وہ فلمی سکرپٹس بھی لکھتے رہے جن کی تعداد اچھی خاصی ہے۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ انہیں اپنے خاندان کی کفالت کے لیے جتنا وہ لکھ سکتے ہیں لکھنا پڑتا ہے۔ اورحان کمال آرام سے بیٹھ کر فرصت کے ساتھ لکھنا نہیں جانتے تھے۔ ان کے ذہن میں مختلف پلاٹ اور بے شمار کردار گردش کرتے رہتے تھے جو دماغ

سے نکل کر دنیا کے سامنے آنے کے لیے بے تاب ہوتے تھے۔ وہ ہمیشہ استنبول کی گلیوں میں پیدل چلتے تھے۔ فینر کا علاقہ جہاں وہ رہتے تھے اس سے کچھ فاصلے پر تھا جہاں وہ اپنا کام دینے جایا کرتے تھے، اوران کے پاس پیدل چلنے کے علاوہ کوئی دوسرا انتخاب نہیں تھا، لیکن اورحان گلیوں میں خوش رہتے تھے۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں وہ شہر اور لوگوں کی دھڑکنوں کا مشاہدہ کر سکتے تھے۔ ان کے کردار چھوٹے اور غیر اہم افراد اور موضوع زندہ رہنے کے لیے ان کی جدوجہد تھی، خواہ وہ شہروں میں رہ رہے ہوں یا چکروا کے قصبوں اور دیہات میں رہتے ہوں۔ ان کا ایمان تھا کہ ایک ادیب کو اپنا فن سماجی ضمیر کے ساتھ استعمال کرنا چاہیے، لیکن جو کچھ وہ تخلیق کر رہا ہے اس کی فن کارانہ خوبیوں کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ ان کا خیال تھا ا ایک ناول یا مختصر کہانی کے پلاٹ پر غور کرتے وقت دو سوال پوچھنے چاہئیں۔

مندرجات: میں یہ کیوں لکھ رہا ہوں؟ وہ کیا بات ہے جو میں قارئین سے کہنا چاہتا ہوں؟

فارم: جو میں کہنا چاہتا ہوں وہ بات کیسے کہوں؟

ان کے ناولوں کو ہم چار اہم موضوعات کے تحت رکھ سکتے ہیں:

1- خودسوانحی ناول۔

2- مزدور کی دنیا اور زندگی، خاص طور پر چکروا کے علاقے میں۔

3- بڑے شہروں کی جانب نقل مکانی۔

4- معاشرے کی نچلی سطح پر زندگیاں بسر کرنے والے اور طبقاتی حدود کو پار کرنے کے متمنی لوگ۔

وہ ترکی کے پہلے ادیب تھے جنہوں نے کاٹن ملوں اور کارکنوں کے استحصال کی داستانیں بیان کرتے ہوئے ترک ادب میں صنعت کاری کے اثرات کو موضوع بنایا۔ ورنہ اورحان کمال کے دَور تک دیہاتی ماحول پر مشتمل ناولوں کے اہم کردار وہی مزدور، جاگیردار اور ان کے گماشتے ہوتے تھے۔ وہ ناول جو شہری ماحول کی عکاسی کرتے تھے متوسط شہری طبقے کے اردگرد گھومتے تھے۔ اورحان کمال کے ناولوں میں صنعتی کارکنوں، فورمینوں اور فیکٹری مالکان کے

درمیان تعلقات کی عکاسی اتنی ہی شدت سے ملتی ہے جتنی جاگیرداروں اور دیہی مزدوروں کے درمیان تعلقات کی۔ وہ ایک دیانت دار ادیب ہیں جو کرداروں کی ناکامیوں اور کمزوریوں پر پردہ نہیں ڈالتے۔ ان لوگوں کی بے بسی قارئین کو تقریباً روہانسا کردیتی ہے۔ ان میں موت، فاقہ کشی اور علاج معالجے کے فقدان کا ذکر ملتا ہے لیکن ان سب چیزوں کے باوجود ایک امید کی کرن بھی نظر آتی ہے۔ زندہ رہنا مقصد ہے جو کسی نہ کسی طرح حاصل کرلیا جاتا ہے اور کردار اس امید سے تسکین حاصل کرتے ہیں کہ آنے والا کل ایک مختلف دن ہوگا۔

اورحان کمال خواتین کی تصویر کشی بڑی محبت اور سمجھ بوجھ سے کرتے ہیں۔ ان کی خواتین زیادہ تر گھر سے باہر کام کرتی ہیں۔ وہ غریب، غیر تعلیم یافتہ ہوسکتی ہیں، لیکن وہ مضبوط اور ہمیشہ اپنے مردوں کے ساتھ کھڑی ہوتی ہیں۔ ان کی تحریروں میں بچے بھی نمایاں ہیں۔ وہ محنت مزدوری کرتے نظر آتے ہیں، ان کا ہر طور پر استحصال کیا جاتا ہے اور اس کا ذمہ دار معاشرے کو گردانا گیا ہے۔ اورحان کمال یقین رکھتے تھے کہ کوئی بھی شخص پیدائشی برا نہیں ہوتا، اور کسی نہ کسی طرح ہر فرد اچھائی کو تلاش کرلیتا ہے۔ یہ بیرونی عوامل ہوتے ہیں جو افراد کو پریشان کرتے ہیں اور انہیں وحشی اور بے حس بنادیتے ہیں۔

خود اپنی زندگی میں اورحان کمال ایسے انسان تھے جو اپنی ذات کے لیے کسی قسم کی عذر خواہی یا معذرت پیش نہیں کرتے، نہ ہی انہوں نے کسی ذاتی فائدے کے لیے اپنے موقف سے ہٹنے کی کوشش کی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ ان کا قدرے بڑی عمر تک بھی پیچھا کیا جاتا رہا۔ 9 مارچ 1966ء کو انہیں کمیونسٹ پروپیگنڈا کے الزام میں دوبارہ گرفتار کرلیا گیا۔ اس بار ان پر الزام لگایا گیا کہ وہ اور دو دوسرے آدمی ''انقلابی سوشلزم پر یقین رکھتے ہیں، جو کہ کمیونزم ہے۔'' اور انہوں نے مصطفیٰ کوتکو، ملزموں میں سے ایک، کے ریستوران کو استعمال کرتے ہوئے کمیونسٹ پروپیگنڈا کے لیے ایک چھوٹا سا گروہ تشکیل دے رکھا تھا۔ ان کی کتاب ''ناظم حکمت کے ساتھ ساڑھے تین برس'' کو جرم میں ماخوذ کرنے والی شہادت کے طور پر پیش کیا گیا۔ تاہم کتاب مکمل قانونی طریقے پر دکانوں میں فروخت کی جارہی تھی اور انہوں نے ریستوران کے مالک مصطفیٰ کوتکو کو اس کی ایک دستخط شدہ جلد پیش کی تھی۔ اورحان کمال نے اس الزام کو رد کرتے ہوئے کہا کہ اس کتاب میں

انہوں نے محض ناظم کے ساتھ گزارے ہوئے قید کے دورانیے کی یادداشتیں بیان کی ہیں اور یہ کوئی کیمونزم کی مدح سرائی میں لکھی گئی کتاب نہیں۔ انہیں ''ترک ورکرز پارٹی'' کے مختلف اجلاس میں تقریر کی دعوتیں دے جاتی تھیں اور وہ انہیں قبول کر لیتے تھے۔ اس بات کو بھی ان کے خلاف پیش کیا گیا تھا۔ ادبی حلقوں میں اس مقدمے کی وسیع پیمانے پر مذمت کی گئی۔ آخرکار 13 اپریل 1966ء کو انہیں رہا کر دیا گیا، اور ایک عدالتی سماعت میں انہیں اور ان کے ساتھی مدعا علیہان کو تمام الزامات سے بری قرار دے دیا گیا۔

سخت اور لگا تار محنت نے اورحان کمال کی صحت پر اثرات مرتب کرنا شروع کر دیئے تھے۔ انہیں 1967ء میں ہارٹ اٹیک ہوا۔ وہ زیادہ عرصے کے لیے کام نہیں چھوڑ سکتے تھے اور وہ اتنے دن آرام نہ کر سکے جتنے دن کے لیے ڈاکٹروں نے مشورہ دیا تھا۔

سوویت رائٹرز یونین نے انہیں میکسم گورکی کی سوویں برسی میں شمولیت کی دعوت دی، لیکن اورحان کمال پاسپورٹ حاصل نہ کر سکے۔ 1968ء میں انہیں ان کے ڈرامے ''بیرک 72 کے قیدی'' کے لیے جو 372 دن تک مسلسل پیش کیا جاتا رہا، کامیاب ترین ڈرامہ نویس قرار دیا گیا۔ 1969ء میں وہ اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ پاسپورٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے اور روس گئے جہاں انہیں مدعو کیا گیا تھا۔ وہ دس روز تک ہسپتال میں رہے، لیکن علاج مکمل ہونے سے پہلے ہی وہاں سے نکل آئے۔

1970ء کے اوائل میں وہ بہت بہتر محسوس کر رہے تھے اور 5 مئی کو وہ بلغاریہ کے لیے روانہ ہوئے۔ وہاں انہیں ان کی دادی کے شہر میں مدعو کیا گیا تھا، لیکن ان کی صحت تیزی سے گر رہی تھی۔ انہیں ہسپتال داخل کرایا گیا، انہیں سٹروک ہوا اور 2 جون 1970ء کو وفات پا گئے۔ 6 جون کو ان کا جسد خاکی سڑک کے راستے ترکی لایا گیا۔ سرحد پر ان کے دوستوں اور چاہنے والوں کا ایک ہجوم جمع تھا۔ جیسے ہی ان کا جنازے کا جلوس ادرنہ میں داخل ہوا، سڑک کے ایک موڑ پر ایک مزدور آگے بڑھا اور اس گاڑی تک پہنچا جس میں اورحان کمال کی میت رکھی ہوئی تھی۔ اس نے پھولوں کے ایک سادہ سے گلدستے کے ساتھ ایک ہاتھ سے لکھا ہوا بینر اس گاڑی پر لگا دیا۔

''ہم مزدور تمہاری یاد میں احترام کے ساتھ جھکتے ہیں۔''

ناظم حکمت کے ساتھ

ساڑھے تین برس

اورحان کمال

I

1939ء اور 1940ء کے درمیانی موسم سرما کا ذکر ہے، میں جیل رجسٹری میں کام کر رہا تھا۔ ایک صبح رجسٹرار تازہ موصول ہونے والی ڈاک چیک کر رہا تھا۔

''واہ!'' اس نے ایک خاص جوش کے ساتھ کہا، ''تمہاری تو قسمت جاگ اٹھی ہے۔''

میں نے حیرت زدہ نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا۔

''تمہارا استاد آ رہا ہے۔''

میں مزید حیران ہو گیا۔ ''کون سا استاد، میں نے تو کبھی کسی کو اپنا استاد یا ایسا کچھ نہیں سمجھا جو اس بیان میں فٹ ہوتا ہو۔''

''کیا تم مجھے بنا رہے ہو۔'' رجسٹرار نے کہا۔

''نہیں تو۔'' میں نے بوکھلائے ہوئے کہا، ''میرا کوئی استاد نہیں ہے۔ کیا میں نے کبھی کسی کو اپنا استاد کہا ہے؟''

''تو پھر یہ دیکھو۔'' اس نے وہ کاغذ میرے ناک کے نیچے گھسیڑتے ہوئے کہا، ''ناظم حکمت، کیا تم اسے اپنا استاد نہیں کہتے۔''

مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ میں نے رجسٹرار کے ہاتھ سے وہ کاغذ جھپٹ لیا اور اسے پڑھنے لگا۔ وہ حقیقت میں آ رہے تھے۔ میری نگاہ ان الفاظ پر رک گئی۔ ''.... شیاٹیکا کے مریض، غسلوں سے مستفید ہونے کے لیے......''

آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا، دن میں بھی روشنی کم تھی اور جیل کے باغ کی کیاریوں میں پھولوں کے پودوں کی پتیاں برف سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ لیکن یہ خبر سننے کے بعد مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اچانک بادل چھٹ گئے ہوں اور سورج اپنی گرم اور پرتپاک کرنیں چار سو بکھیرنے لگا ہو اور اپنی ان کرنوں میں جیل کی ٹھٹھری ہوئی پژمردگی، گھر سے دور جیل میں گزارے ہوئے ایام کا بوجھل پن اور قید میں بتائے جانے والے آئندہ برسوں کی ناامیدی کو اپنے ساتھ بہا کر لے گیا ہو۔

ابھی تک مجھے اس شخص سے ملاقات تو در کنار کبھی سلام تک کرنے کا بھی شرف حاصل نہیں ہوا تھا۔ اور یہ کبھی میرے تصور سے بھی نہیں گزر را تھا کہ ایک دن میں ان کا دوست بن جاؤں گا۔ بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح میں بھی اُن کے چاہنے والوں میں شامل تھا اور اسی طرح بہت سے دیگر لوگوں کی طرح اُن سے ناراض بھی تھا، نہ جانے کیوں؟ لیکن شاید اور دوسرے لوگوں کی طرح اُن سے محبت بھی کرتا تھا اور یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ کیوں؟ یا ہو سکتا ہے اس کی کوئی موہوم سی وجہ میرے ذہن میں ہو، شاید اُن کی وہ غیر معمولی، پرتخیل اور روح پرور نظمیں............

دیکھو!

ارے!

احمق انسان!

ٹونگ ٹونگ کا شور مچانے والا اپنا یہ ڈبہ پھینک دو،

یہ تین تاروں والا طنبورہ

جس کی تین تاروں پر

تین کمزور بلبلیں چہچہا رہی ہیں

بالکل بیکار ہے!

دیکھو!

ارے!

احمق انسان!

یہ تین تاروں والا طنبورہ
جس کی تین تاروں پر
تین کمزور بلبلیں چہچہا رہی ہیں
کبھی بھی پہاڑوں کو نہیں دھکیل سکتا
کبھی بھی لہروں کو، عوام کو آگے نہیں ہانک سکتا!

یہ تین تاروں والا طنبورہ
اس طاقت کے ساتھ جو یہ قصبوں سے، دیہاتوں سے،
اور اپنے کناروں سے اُچھلنے کو بے تاب دریاؤں سے حاصل کرتا ہے
لاکھوں انسانوں کو بہ یک آواز
ہنسنے یا رونے پر مجبور نہیں کر سکتا۔

O

ٹررررم،
ٹررررم،
ٹررررم!
میں میکانائزڈ ہونا چاہتا ہوں
یہ میرے دل کی، میرے جسم کی، میرے اندر کی آواز ہے
میں ہر اُس ڈائنمو کو ہتھیا لینا چاہتا ہوں
جو میرے ہاتھ لگ سکے!

O

اُفق تا بہ اُفق
کیسپین کی جھاگ اُڑاتی، ٹھاٹھیں مارتی ارغوانی لہریں
تیز چلتی ہوئی ہواؤں کی زبان بولتی ہیں، میرے بچے،
شور مچاتی اور بل کھاتی ہوئی!

کون کہتا ہے، ''اس کی بات نہ کرو''؟

(کون کہتا ہے) کیسپین ایک مردار جھیل جیسا ہے؟

ایک بے کنار وسعت،

محض نمکین پانی، کیسپین کا کوئی مالک نہیں!

دوست اور دشمن

کیسپین میں گھومتے ہیں!

لہر ایک پہاڑ ہے

کشتی ایک ہرن ہے!

لہر ایک کنواں ہے

کشتی ایک بالٹی ہے!

کشتی اوپر جاتی ہے

کشتی نیچے آتی ہے

ایک بدمست اُکھڑ گھوڑی سے نیچے اترتے ہوئے

ایک دوسرے منہ زور گھوڑے پر سوار ہو جاتی ہے!

O

ارے تم!

تم، کالے سینگوں جیسے ابروؤں والے

اور مقدس 'Apis' کے سر والے انسان!

ارے تم!

حکم کے گولے! تم جو نجیبوں کی زبان میں منظوم گفتگو کرتے ہو،

میں کسی نجابت کو نہیں جانتا۔

تم جو زبان بول رہے ہو میں کسی تعظیم کا اظہار نہیں کروں گا،
میں نجابت کا دشمن ہوں
خواہ یہ لفظ کسی فرہنگ میں ہی نظر آئے۔

ارے تم!
حکم کے گولے!

میں تمہاری اس برہمی
اور تمہاری اِن شکایات کی وجہ جانتا ہوں۔
میں جانتا ہوں تم رات کی انتظار میں ہو
میرا گلا گھونٹنے کے لیے، جب میں سو جاؤں۔
میں جو کلائیوں میں لوہے کی تاروں کی کڑیاں یوں پہنے ہوئے ہوں
گویا وہ سونے کے کنگن ہوں
میں جو اپنے اوپر لٹکتے ہوئے رسی کے پھندے کو دیکھ چکا ہوں
اور اپنی مضبوط بالوں بھری گردن پر ہاتھ پھیر رہا ہوں،
کیا کبھی
تمہاری دھمکیاں مجھے خوف زدہ کر سکتی ہیں؟

O

زندگی بسر کرنا کتنا شان دار ہے
''تارستا بابو''

زندہ ہونا کتنا خوب صورت ہے
زندگی کو ایک ادبی شہ پارہ سمجھتے ہوئے بسر کرنا
زندگی کو ایک طویل نغمے کی طرح سنتے ہوئے بسر کرنا
زندگی کو ایک بچے جیسی حیرانی میں بسر کرنا
زندگی گزارنا......

زندگی گزارنا:

اکیلے میں

اور مل جل کر

ریشمی کپڑا بُننے کی طرح.....

O

مَیں اُسی وقت دبے پاؤں رجسٹری سے باہر نکل آیا اور اپنے وارڈ کی جانب چل پڑا۔ میں یہ خبر فوری طور پر اپنے دو قیدی ساتھیوں کو سنانا چاہتا تھا، جو میری طرح نظمیں لکھتے تھے اور خود کو شاعر خیال کرتے تھے۔

ان میں سے ایک کا نام ''نجاتی'' تھا۔ وہ میرا ہم عمر تھا اور اپنی ساڑھے سات سال کی قید میں سے پانچ سال گزار چکا تھا۔ اس نے یہ پانچ سال بغیر کسی قسم کی مالی مدد کے کسمپرسی میں ہی گزارے تھے۔ اس کی استنبول جیل میں ناظم حکمت سے ملاقات ہو چکی تھی اور وہ ان کا اچھا دوست بن چکا تھا۔ اس نے ناظم حکمت کے بارے میں مجھے بہت کچھ بتایا تھا، وہ ان سے بالمشافہ باتیں کر چکا تھا اور وہ دونوں دوست تھے۔ نجاتی اس وقت جیل کے ایڈمن یونٹ میں صفائی کر رہا تھا۔ میں سیڑھیاں اتر کر ملاقاتیوں کے لیے لگائی گئی جالی کے پاس سے گزر کر اس تک پہنچا۔

''کیا تم نے سنا ہے؟'' میں نے کہا، ''ناظم حکمت آ رہے ہیں۔''

اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ میں نے قسمیں کھائیں تو اس نے کسی چھوٹے بچوں کی طرح تالیاں بجاتے ہوئے چیخ کر کہا، ''یہ تو کمال کی بات ہے۔''

پھر اس نے ناظم حکمت کے بارے میں بولنا شروع کر دیا۔ ان کی لکڑی کی کھڑاؤں کا ذکر کیا جو وہ استنبول جیل میں پہنا کرتے تھے۔ ان کے سبز رنگ کے لمبے اُونی چغے کی باتیں کیں۔

''سنو، میرا خیال ہے کہ ہمیں عزت اور تمام لوگوں کو پہلے سے بتا دینا چاہیے۔'' اُس نے فوراً سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا، ''تاکہ وہ اُن کے پاس جا کر خواہ مخواہ میں اپنی نظمیں سنانا یا ایسی ہی کوئی دوسری حرکتیں نہ شروع کر دیں۔ وہ ایسی باتوں کو اچھا نہیں سمجھتے۔ بہت زیادہ سوالات سے بھی وہ تنگ پڑ جاتے ہیں۔ میرا تو خیال ہے تمہیں عزت کو بتانا ہی نہیں چاہیے کہ وہ آ رہے ہیں۔''

اس نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا، ''ورنہ 'ناظم' 'اوخو' کہیں گے اور اپنا بوریا بستر اٹھا کر کسی دوسرے وارڈ میں چلے جائیں گے۔''

نجاتی جو کچھ کہہ رہا تھا وہ ویسا ہی تھا جیسے ''مشہور شخصیات'' کا برتاؤ ہوتا ہے لیکن چلو ہم نہیں بھی ملتے، ہم دوست نہیں بھی بن سکتے، کم از کم میں ان کا چہرہ تو دیکھ لوں گا اور ان کی آواز سن سکوں گا۔

''میں ان کے وارڈ میں نہیں جاؤں گا، میں ان سے کوئی سوال نہیں کروں گا اور میں انہیں اپنی نظمیں نہیں سناؤں گا یا کوئی ایسی حرکت نہیں کروں گا۔'' میں نے اپنے آپ سے کہا۔

میں اپنے وارڈ میں پہنچ گیا۔ عزت ''کیرا کیرالینا'' پڑھ رہا تھا جو کہ اس نے مجھ سے لی تھی۔ دوسرے تمام قیدی بھی کچھ نہ کچھ کرنے میں مصروف تھے۔ ان میں سے ایک انگیٹھی میں کوئلے ڈال رہا تھا۔ دوسرے نے اپنا چھوٹا سا ساس پین دہکتے ہوئے کوئلوں پر رکھا ہوا تھا اور اس کے ابلنے کا انتظار کر رہا تھا۔ ایک اور شخص چاول چن رہا تھا تاکہ پکانے سے پہلے انہیں صاف کیا جا سکے۔ وہ جو کوئی کام نہیں کر رہے تھے گدوں کے ڈھیر کے ساتھ کمریں ٹکائے نیم دراز حالت میں آرام کر رہے تھے۔ ایک آدمی اخبار کا مطالعہ کر رہا تھا۔

خوشی کے طوفان کو بمشکل اپنے اندر تھامے ہوئے میں عزت کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ اس نے کتاب سے نظریں اٹھا کر میری جانب ایک اچٹتی ہوئی بے کیف نگاہ ڈالی، ایک ایسی نگاہ جس کا میں ہر روز سامنا کرتا تھا، مکمل اکتاہٹ کے ساتھ یہ پیغام دیتی ہوئی نگاہ کہ اس جیل کے اندر جس کا ہر پتھر، ہر پھول، زمین کا ہر ہر انچ زبانی یاد ہو چکا تھا، کہنے کے لیے کوئی نئی بات باقی نہیں رہ گئی۔

عزت کے عقب میں واقع کھڑکی سے مجھے پہاڑ نظر آ رہے تھے۔ وہ جھیل جس کی سطح اس قدر خاکستری تھی کہ سیسے سے ڈھکی ہوئی نظر آتی تھی اور نہ ہی برف سے ڈھکی ہوئی پہاڑوں کی چوٹیاں اس دن مجھے افسردہ کر سکیں جیسا کہ وہ عام طور پر کیا کرتی تھیں۔ اس کے برعکس میں اپنے اندر مسرت اور خوشی کے سوتے پھوٹتے محسوس کر رہا تھا۔

''آج تم بہت زیادہ خوش نظر آ رہے ہو۔'' عزت نے کہا۔

''اچھا تو کیا میں تمہیں خوش نظر آ رہا ہوں؟'' میں نے پوچھا۔

''تم ایسے نظر آ رہے ہو جیسے یہاں آنے کے پہلے روز تھے۔ تمہاری معمول کی پرمژدگی کہاں چلی گئی ہے؟''

عزت ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ گزشتہ چند دنوں کے دوران میں بہت زیادہ پرمژدہ ہو چکا تھا۔ یہ کوئی اتفاقی معاملہ نہیں تھا۔ تین ماہ پہلے میرے ساتھ ایک ایسا حادثہ پیش آیا تھا جس نے میرے مزاج کو بدل ڈالا تھا۔ میری ایک ایسے شخص سے دوستی ہو گئی جو اپنے آپ کو سکول ٹیچر بتاتا تھا۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ جرمنی کی کسی یونیورسٹی میں فزکس کا طالب علم تھا، اور اسے اپنی پڑھائی درمیان میں چھوڑنی پڑ گئی۔ یونیورسٹی کے نام کے بارے میں زیادہ تردد کی ضرورت نہیں، وہ فزکس کے بارے میں شاید اتنا بھی نہیں جانتا تھا جتنا میں اور عزت جانتے تھے۔ اس کے فوراً بعد یہ کہانی پوری بیرک میں پھیل گئی اور ہر کوئی اس ''نقلی ٹیچر'' کا مذاق اڑانے لگا تھا۔ وہ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بڑی خوش دلی سے ہر بے عزتی اور تہمت برداشت کر جاتا۔

جہاں تک میرا تعلق تھا مجھے اس سے ہمدردی تھی۔ اس کی سزا اگرچہ بہت مختصر سی تھی پھر بھی اسے کبھی کبھار ایک وارڈر کی نگرانی میں باہر گھومنے پھرنے کی اجازت مل جایا کرتی تھی اور جب بھی وہ اپنے اس سیر سپاٹے سے واپس آتا تو اُن چچاؤں سے ملاقات اور مالی امداد کی بڑیں مارتا، جو اکثر ممبر پارلیمنٹ یا کوئی بڑے حکومتی افسر ہوا کرتے تھے۔ بعد میں ہمیں پتا چلا کہ وہ سارے چچا محض اس کے تخیل کی پیداوار تھے۔ وہ اتنا غریب اور ایسی قابلِ رحم حالت میں تھا کہ جس دن اسے باہر جانے کی اجازت ملتی، میں اپنی بنیان اور جوتے اتار کر اسے دیتا تھا۔ وہ میری بنیان، میرا ازیر جامہ، میرا کوٹ اور میرے جوتے پہن کر جاتا اور میرے ہی خلاف حکام کو مخبریاں کرتا۔ وہ انہیں جھوٹ کے پورے پورے پلندے جوڑ کر سناتا۔ پھر میری جواب طلبی کی جاتی، مجھے بیان دینا پڑتا اور مکمل طور پر بلا جواز اور غیر ضروری تشدد کا بھی سامنا کرنا پڑتا۔ ہر مرتبہ وہ میرے دوستوں کے ساتھ مل کر مجھ سے ہمدردی کا اظہار کرتا اور میرے بارے میں مخبری کرنے والے کو خوب صلواتیں سناتا اور اس کی شدید مذمت کرتا۔ آخر کار جب اس کی سزا پوری ہو گئی اور وہ جیل سے جا رہا تھا تو میرے گلے لگ کر یہ کہتے ہوئے پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا:

"مجھے آپ جیسا کوئی اور دوست اب کہاں ملے گا؟"

اس کے جیل سے جانے کے تین روز بعد ہی مجھے پتا چلا کہ وہی تھا جو میری مخبری کیا کرتا تھا اور جھوٹ کی بے ربط داستانیں جوڑتا تھا۔ یہ وہ آدمی تھا جو حکام کو غیر ضروری باتوں میں الجھا کر ان کا وقت ضائع کرتا تھا اور ستم ظریفانہ پہلو یہ تھا کہ وہ میری بنیان، میرے کپڑے اور میرے ہی جوتے پہنتا تھا اور یہ وہ شخص تھا جو جیل سے رہائی ملنے پر سسکیوں کے ساتھ یہ کہتے ہوئے میرے گلے لگ گیا تھا: "مجھے آپ جیسا کوئی اور دوست اب کہاں ملے گا؟"

اس واقعہ کے بعد میں نے کسی بھی شخص سے اس طرح کے دوستانہ تعلقات قائم نہ کرنے کا فیصلہ کرلیا کیوں کہ ایک شخص نے اپنے آپ کو اس حد تک گرالیا تھا، لہٰذا ہر شخص کے لیے میرا رویہ معاندانہ ہو گیا تھا۔ شاید اس معاملے میں میرا یہ رویہ جائز نہیں تھا لیکن میں مجبور تھا۔ میں دوسرے انداز میں سوچنے کے قابل نہ تھا اور نہ ہی میں جانتا تھا کہ لوگوں کی حقیقت کو پہچاننے کا کیا طریقہ ہے۔

میری اس پژمردگی کی چند اور وجوہات بھی تھیں.........

جیل میں تقریباً ہر روز چاقو گھونپنے کا کوئی نہ کوئی واقعہ رونما ہو جاتا تھا۔ مچھیرے نذیر، قبیح انسان شوکت، ایک بازو والا حسن جو عنتاب سے تھا، فیری کوئے (Feriköy) کا اسماعیل، قونیہ کا پاگل ممت اور ان کے پٹھو ہر روز جوئے یا منشیات پر کسی جھگڑے کے نتیجے میں کسی نہ کسی کی گھات میں منتظر بیٹھے ہوتے اور موقع ملتے ہی چاقو وغیرہ سے حملہ کر دیتے تھے۔

نجاتی کے انتباہ کے باوجود میں نے عزت سے کہا: "میرے پاس تمہارے لیے ایک خبر ہے۔ میں تمہیں کچھ بتانا چاہتا ہوں، لیکن تم کسی سے میرا ذکر نہ کرنا۔"

اس نے مجھے منتظر نظروں سے دیکھا۔

"ناظم آ رہے ہیں۔" میں نے کہا۔

میرا خیال تھا کہ اُسے بھی اس خبر پر میرے جتنی خوشی ہوگی اور وہ لپک کر مجھے گلے لگائے گا۔ اس کی بجائے اس نے بڑی سرد مہری سے کہا:

"کون ناظم؟"

''یار، ناظم حکمت، اور کون۔''

اس نے اسی سرد مہری سے جواب دیا، ''کب؟''

''کب؟ مجھے معلوم نہیں، رجسٹرار نے مجھے اس کے بارے میں ایک خط دکھایا تھا، لیکن بہتر ہے کہ تم رجسٹرار سے پوچھو۔''

اس نے کندھے اچکائے۔ ''تمہیں خوشی ہو سکتی ہے۔ مجھے کیا ضرورت ہے؟''

میں اپنی جگہ ساکت ہو کر رہ گیا۔ گویا ایسے لوگ بھی ہیں جنہیں ناظم کے آنے یا نہ آنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا!

میں نے عزت کو اس کی ''کیرا کیرالینا'' (Kyra Kyralina) کے ساتھ وہیں چھوڑا اور اوپر والی بیرکوں کی جانب چل پڑا۔ میں تقریباً دوڑتا ہوا اس بیرک میں گیا جہاں سری یر (Sariyer) سے آنے والا امین بے مقیم تھا۔ امین بے ایک جیب کترا تھا جو مجھے کئی مرتبہ بتا چکا تھا کہ وہ استنبول کی جیل میں ناظم حکمت سے مل چکا تھا۔ وہ شطرنج یا برط (12، 12 مہروں سے کھیلے جانے والے ایک کھیل)، مجھے اچھی طرح یاد نہیں کہ کون سا کھیل، بہر حال انہی دو میں سے کوئی کھیل کھیلتے ہوئے ایک دوسرے کے واقف بنے تھے۔ امین بے گہرے سانولے رنگ کا لمبا تڑنگا شخص تھا اور اس کی آنکھیں بادام کی شکل کی تھیں۔ اس نے نیلے رنگ کی فوجی ٹوپی ترچھی اوڑھ رکھی تھی جو اس کی دائیں آنکھ پر جھکی ہوئی تھی اور بیرک کے دروازے پر اکڑوں بیٹھا سفید لوٹے سے پانی چھان رہا تھا جو اس نے ابھی ابھی اُبالا تھا۔

''میرے پاس تمہارے لیے ایک خبر ہے......'' میں نے بات شروع کی۔

''ہوں؟ تو پھر جلدی سے سنا دو۔''

''لیکن کسی کو یہ نہ بتانا کہ یہ خبر میں نے سنائی تھی.....''

''ٹھیک ہے۔''

''ناظم آرہے ہیں۔''

''جاؤ بھئی، میں نہیں مان سکتا۔''

''میں قسم کھاتا ہوں۔''

وہ کھڑا ہو گیا اور اپنی ٹوپی کو پیچھے کھسکاتے ہوئے بولا، ''تم مجھے بتا تو نہیں رہے۔''

''دیانت داری سے بتا رہا ہوں، میں ابھی ابھی رجسٹرار کے دفتر میں ان کی آمد کی دستاویزات دیکھ کر آیا ہوں۔ وہ شیائیکا میں مبتلا ہیں۔''

ایک لمحے کے لیے امین بے وفور جذبات سے کانپا۔

''اوہ، اچھا...... عظیم ناظم!''

اور اس نے استنبول جیل کے ان کے قصے سنانے شروع کر دیئے۔ میں یہ باتیں پہلے بھی کئی بار سن چکا تھا۔ حقیقت میں وہ سب مجھے زبانی یاد ہو چکی تھیں۔ میں چاہتا تھا کہ امین بے اپنی بات مختصر کرے تا کہ میں کچھ دوسرے لوگوں کو بھی یہ خبر سنا سکوں۔

اس میں زیادہ دیر نہیں لگی اور ڈیڑھ دو گھنٹے میں ان کی آمد کی خبر پوری جیل میں پھیل چکی تھی۔ ناظم حکمت آ رہے تھے...... یہ بات پراسیکیوٹر کے دفتر میں کاغذات سے پتا چلی تھی۔

نجاتی کا تبصرہ تھا: ''لڑکے، تمہارے پیٹ میں کوئی بات پچتی نہیں۔'' اور ہم نے باتیں شروع کر دیں۔

''ہم انہیں اپنی نظمیں سنائیں گے۔''

''نہیں یار، ہماری بھی کوئی نظمیں ہیں؟''

''تمہاری بھی کوئی اتنی بری تو نہیں ہیں۔''

''میں کبھی سکول نہیں گیا۔''

''میں نے مڈل سکول مکمل نہیں کیا ہوا۔''

''پھر بھی تمہارا مطالعہ تو کافی ہے۔ تم تو پرانے عربی حروف بھی پڑھ لیتے ہو۔ میرا کیا ہوگا؟''

''تمہارا مطلب ہے کہ وہ اپنا بوریا بستر اٹھائیں گے اور............''

''وہ یہ برداشت نہیں کریں گے۔''

''............''

''............''

''کیا تم نے کبھی انہیں نظمیں پڑھتے سنا ہے؟''

''ہاں، سنا ہے۔ جب وہ پڑھ رہے ہوتے ہیں تو لوگوں کے چہرے جذبات سے تمتما رہے ہوتے ہیں۔ میں تمہیں بتاتا ہوں، اگر وہ ایک روتے ہوئے بچے کو گود میں بٹھا لیں تو وہ رونا بند کر دیتا ہے۔''

''میں نے ان کے بارے میں ایک کہانی سن رکھی ہے کہ وہ اپنی جیب میں کافی رقم ڈال کر مزدوروں کے کسی چھوٹے سے قہوہ خانے میں چلے جاتے تھے۔ وہ وہاں موجود سب سے زیادہ غریب آدمی کے پاس جاتے اور کہتے، میرے پاس تو یہ رقم ہیں، اب تم اپنی رقم دکھاؤ۔ وہ آدمی قدرے شرمساری کے ساتھ اپنی جیب میں پڑے چند چھوٹے سکے نکال کر دکھا دیتا۔ پھر ناظم اس سے پوچھتے تمہارے پاس اتنی کم رقم کیوں ہے؟ وہ آدمی خاموشی کے ساتھ نیچے فرش کی جانب دیکھنا شروع کر دیتا۔ ناظم کہتے، یہ رقم ادھر لاؤ، آؤ ہم دونوں اپنی اپنی رقم اکٹھی کر لیتے ہیں اور پھر آدھی آدھی بانٹ لیں گے۔ اور وہ بالکل یہی کرتے، رقم اکٹھی کرتے اور اسے برابر حصوں میں بانٹ دیتے۔''

''..............!''

II

کئی ہفتے گزر چکے تھے۔ وہ دوبارہ ایک بوجھل سی صبح تھی۔ پھولوں کی پتیوں پر اب بھی برف جمی ہوئی تھی..... نجاتی اندر آیا، اس کی سانس اکھڑی ہوئی تھی۔

''وہ ابھی ابھی ناظم حکمت کو لے کر آئے ہیں...... چند منٹ پہلے۔''

معمول کے مطابق میں جیل رجسٹری میں تھا اور قیدیوں سے متعلق ایک رجسٹر کا مطالعہ کر رہا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ میرے ہاتھ سے قلم گر گیا تھا۔

''وہ انہیں گورنر کے دفتر میں لے گئے ہیں۔'' اس نے کہا، ''میں نے انہیں تمہارے بارے میں بتایا ہے۔ فوراً آؤ، وہ جلدی باہر آ جائیں گے۔''

اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور مجھے اپنے ساتھ گھسیٹتا ہوا چل پڑا۔ میں بہت زیادہ پُرجوش اور جذباتی ہو رہا تھا، میرے سر پر چھت مجھے گھومتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ میرے ذہن میں The Son of the Kadi of Simavna، بینرجی (Banerci) اور La Gioconda (مونالیزا) کی سطریں گونج رہی تھیں۔

نجاتی نے ناظم کے سامان کی جانب اشارہ کیا۔ وہ جیل کے ایڈمن یونٹ کے سامنے کنکریٹ کے فرش پر پڑا تھا، چارخانے کپڑے میں پھٹا ہوا ایک گدا، دو چمڑے کے گھسے پھٹے پرانے سوٹ کیس، ایک ٹوکری..... تو کیا وہ بھی ہم جیسا ہی کوئی عام سا انسان تھا؟ وہ شاعری کے علاوہ بھی چیزوں کے بارے میں سوچتا تھا، دنیاوی چیزوں کے بارے میں؟ کیا اس کے پاس بھی

گدڑا، سوٹ کیس اور ٹوکری تھے؟

لیکن انہیں تو ایک ''فوق البشر'' ہستی ہونا چاہیے، ایک فطین انسان! میں آج تک کسی فطین انسان کو نہیں دیکھا تھا، میں نہیں جانتا تھا کہ فطین لوگ کیسے ہوتے ہیں.....

جیسے بھی تھا، وہ جو بھی تھا، آدمی جو گورنر کے دفتر سے برآمد ہونے والا تھا، ''اس کے سر پر بھیڑ کی کھال کی ایک بھاری بھرکم کالی ٹوپی ہوگی۔'' نہیں، ''یہ ٹوپی نہیں، اس نے اپنے سر پر پیٹ سے چاک کی ہوئی ایک ان منڈھی بھیڑ ڈال رکھی ہے!'' شاید'' وہ آلتی پالتی مارے پتوار پر بیٹھا ہوا ہے۔''

اور یقیناً۔۔۔

''وہ کشتی کو اپنی لپیٹ میں لیتے ہوئے پانیوں پر نگاہ نہیں ڈالتا۔''

''وہ اپنے سامنے موجود اور دُور جاتے پانیوں پر نظر نہیں ڈالتا۔''

اس میں کوئی شک نہیں، وہ شخص جو برآمد ہونے والا تھا، واضح طور پر'' ترکمانستان سے بدھ کا ایک مجسمہ'' ہے۔ بدھ کا سنگ مرمر کا مجسمہ شاہی انداز میں پتوار پر آلتی پالتی مارے بیٹھا ہے۔ اپنے سامنے جدا ہوتے پانیوں پر نگاہ ڈالنا مناسب نہ خیال کرتے ہوئے!

''......وہ خلل اندازی کو برداشت نہیں کرسکتے، وہ اپنا گدڑا لپیٹیں گے اور......''

گورنر کے دروازے سے ایک تیز چرچراہٹ کی آواز بلند ہوئی اور پھر دروازہ کھل گیا۔ میں نے اپنا سانس روک لیا، چہرے پر تناؤ لے آیا...... میں ایک بت کی طرح ساکت کھڑا تھا۔ اور میں ایک دبدبے والا سنگ مرمر کا مجسمہ دیکھنے کی توقع لیے ہوئے تھا۔

سیکنڈ کے ایک حصے کے لیے ہم ایک دوسرے کے آمنے سامنے آئے پھر ہماری نگاہیں ملیں، ان کی آنکھیں مسکراتی ہوئی گہری نیلی تھیں۔ ان کی اس مسکراہٹ نے مجھے ایک بچے کی سی خالص، تازہ، صحت مند اور دوستانہ مسکراہٹ یاد دلا دی۔

وہ ایک لمحے کے لیے تذبذب کے عالم میں رُکے۔ غالباً وہ اندازہ لگا رہے تھے کہ انہیں کیا کرنا چاہیے۔ شاید وہ مانوس اور جانے پہچانے چہروں کو تلاش کر رہے تھے۔ پھر ان کی نگاہیں نجاتی پر پڑیں وہ اس کی جانب بڑھنے ہی والے تھے، لیکن اس سے پہلے نجاتی بھاگتا ہوا ان

کے پاس گیا اور میرا تعارف کروایا۔

ہم نے ہاتھ ملائے۔ انہوں نے ایک ٹک کی آواز کے ساتھ دونوں ایڑیاں ایک ساتھ بجائیں اور فوجیوں کی طرح اٹینشن کھڑے ہو گئے۔ سنجیدہ نظر آنے کی کوشش کرتے ہوئے جیسا کہ وہ اپنے آپ کو کسی رسمی تقریب کے لیے تیار کر رہے ہوں، انہوں نے کہا:

''میں ناظم حکمت ہوں۔''

یہ سب کچھ بہت تیزی سے ہوا۔ انہوں نے تیز نظروں سے پورے ہال کا جائزہ لیا۔ وہاں بہت سے لوگ جمع تھے۔ وہ لوگ جو ناظم کو دوسری جیلوں سے جانتے تھے اور دوسرے جو انہیں ان کی شہرت کی وجہ سے جانتے تھے...... جب انہیں اس ہجوم میں کوئی ایسا آدمی نظر آتا جسے وہ جانتے تھے وہ تیزی سے اس کے پاس جاتے اور باپ، بیٹے یا چھوٹے اور بڑے بھائی کی طرح جو کئی برسوں سے ایک دوسرے سے بچھڑے ہوں، گلے ملتے اور ایک دوسرے کا منہ چومتے۔

''او، میرے پیارے بھائی، یہ تم ہو...... اچھا تو تم بھی یہیں ہو؟''

''اور تم بھی یہیں ہو اور وصفی بھی؟ تمہاری اپیل کا کیا بنا؟ کیا اپیل کورٹ نے اسے مسترد کر دیا تھا؟ کیا انہوں نے اسی فیصلے کو برقرار رہنے دیا؟ کیا یہ ہمارے چانکیری جیل منتقل ہونے کے بعد ہوا تھا؟...... مجھے حقیقت میں افسوس ہے، چلو چھوڑو، فکر مت کرو، پیسوں وغیرہ کا معاملہ کیا ہے؟ کیا تمہیں گھر سے کسی قسم کی مدد نہیں پہنچتی؟ اچھا تو تمہیں گورنر نے قرنطینہ اقامت گاہ میں کام پر لگا دیا ہے۔ یہ اچھی بات ہے......''

وہ ایک اور آدمی کی جانب بڑھے جس کے جسم پر چیتھڑے لٹک رہے تھے۔ یہ آدمی چوبیس سالہ نوجوان بڑے بڑے ننگے پیروں کے ساتھ منجمد کر دینے والے ٹھنڈے کنکریٹ کے فرش پر کھڑا کنگال اور مفلس ''دیوانہ رمزی'' تھا۔ وہ وارڈ 72 کا رہائشی تھا۔ یہ وارڈ دوسرے حصے کی اوپر والی منزل پر تھا، یہ وارڈ کنگال اور مفلس قیدیوں کے لیے مخصوص تھا، ان قیدیوں کے لیے جن کے پاس کچھ بھی نہیں ہوتا تھا اور جیل کے سلسلہ مراتب میں سب سے نچلے درجے پر ہوتے تھے۔ اس کی تمام کھڑکیاں، دروازے حقیقتاً لکڑی کی ہر چیز توڑ کر وارڈ کے فرش پر رکھ کر جلا دی گئی ہوئی

تھیں کیوں کہ اپنے ٹھٹھرے ہوئے جسموں کو حرارت پہنچانے کا ایک ہی ذریعہ انہیں میسر آتا تھا، اور لوگ ان کے شعلوں کی لرزتی ہوئی روشنی میں سگریٹوں کے ٹوٹوں کی ملکیت کے لیے پاسہ پھینک کر فیصلہ کرتے تھے۔ تمام کھڑکیاں ٹوٹی ہوئی تھیں، بارش اور برف کی بوچھاڑ اور یخ بستہ ہوا ساری رات بلا روک ٹوک وارڈ میں آتی رہتی اور یہاں کے بد بخت مقیم کچھ گرمی حاصل کرنے کے لیے ایک دوسرے میں گھس کر لیٹتے تھے۔ ''دیوانہ رمزی'' اسی وارڈ میں پاگل پن کا شکار ہوا تھا۔

''......رمزی پھر کیا ہوا؟ اور تمہیں تیس سال کی قید ہوگئی؟ کس پاداش میں؟ تم نے کسی کو مار ڈالا تھا؟ جیل میں کوئی آدمی کسی آدمی کو کیسے قتل کر سکتا ہے، رمزی؟ کیا؟ کیوں کہ تمہیں یہ کرنا پڑا تھا؟ لہٰذا تم نے اسے مار ڈالا کیوں کہ تمہیں یہ کرنے پر مجبور کر دیا گیا تھا؟ رمزی، تم نے یہ سب کیسے کر دیا؟ میرے بیٹے کیا یہ مناسب بات تھی؟ محض سات لیروں کی خاطر ایک آدمی دوسرے آدمی کو کیسے قتل کر سکتا ہے؟ ہاں، تم نے بہت بڑی حماقت کی تھی؟ لیکن تمہیں تیس سال کی سزا ہوگئی! یہ حقیقتاً افسوس ناک بات ہے...... بہر حال تم انسان ہو...... اپنے آپ کو لعن طعن کیوں کرتے ہو؟''

رمزی نے جلدی سے ناظم کے کان میں کوئی سرگوشی کی۔ نجاتی نے اپنی کہنی سے مجھے ٹہوکا دیا۔ یقیناً رمزی سگریٹوں کے لیے پیسے مانگ رہا تھا۔

''بعد میں......'' ناظم نے کہا، ''میرے پاس اس وقت ریزگاری نہیں ہے۔''

پھر وہ جیل کے ''شہزادوں'' میں سے ایک کی جانب بڑھے جو کہ اپنے پوستین کے اوورکوٹ میں سمٹا بیٹھا تھا۔ ناظم نے اس کا حال چال پوچھا اور دریافت کیا کہ وہ مشینیں جو جرابیں بنانے کے لیے استعمال کی جاتی تھیں ابھی تک کام کر رہی ہیں یا نہیں۔ اور استنبول جیل میں استعمال کی جانے والی دھاگے کی لچھیوں کی تعداد پر بحیرۂ اسود کے چھوکرے سے ہونے والے جھگڑے کا کیا بنا تھا؟ لیکن ''شہزادہ'' بہت عرصہ پہلے ہونے والی یہ تمام باتیں بھول چکا تھا۔

پھر سری یر کا امین بے سامنے آ گیا۔

''امین بے! تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی، میرے پرانے دوست، میرے استاد، میرے دل کے ساتھی۔'' (ترکی میں استاد تکریم اور احترام کے اظہار کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے)۔

وہ دونوں ایک دوسرے کے گلے ملے۔ ''اچھا، امین بے، یہ حقیقت میں تم ہی ہو، واہ؟ تم یہاں؟ انہوں نے تمہیں کس لیے جلاوطن کیا؟ تم نے تو کبھی جوں تک نہیں ماری...... نہ ہی تم چاقوزنی یا ہیروئن وغیرہ میں ملوث تھے۔ تمہارے مقدمے کا کیا بنا؟ ساڑھے سات سال؟ کیا اپیل کورٹ نے اسے مسترد کر دیا تھا؟ نہیں، یہ ناقابل یقین بات ہے...... لیکن حالات کے مطابق تو سزا میں تخفیف کا جواز موجود تھا...... اوہ، ٹھیک ہے وقت جلد گزر جائے گا۔ اور...... اس کا کیا نام ہے...... مجھے پتا چلا ہے کہ وہ بھی یہیں ہے، ارطغرل۔ کیا یہیں ہے؟ بہت بدمعاش ہے۔ میں نے برط میں بہت زیادہ مہارت حاصل کر لی ہے، امین بے۔ اب میں یقیناً اسے ہرا دوں گا، دمتری بھی یہیں ہے، مجھے بتایا گیا ہے۔ میرا مطلب ہے یوڈی کلون کی شہرت والا دمتری...... اچھا تو...... ہمارے تمام دوست یہاں ہیں۔ یہ اچھی بات ہے۔ بہت اچھی۔''

میرے نزدیک وارڈر کھڑا تھا...... وہ گاؤں میں پلا بڑھا تھا۔ اس نے اپنے ایک ساتھی سے کہا: ''کتنا پسندیدہ شخص ہے!''

اس دوران امین بے نے پوچھا: ''استاد کیا اب بھی آپ پینٹنگ کرتے ہیں؟''

''میں کافی حد تک بہتر ہو گیا ہوں...... دیکھو......''

وہ اس جانب چل پڑے جہاں ہال کے کونے میں ان کا سامان پڑا تھا۔ وارڈرز پہلے سے ہی اسے کھنگالنا شروع کر چکے تھے۔ جب انہوں نے ان کے سوٹ کیس کی تلاشی لے لی تو ناظم نے ان کی باقی ماندہ تلاشی میں کوئی دلچسپی ظاہر نہ کی۔ وہ اپنا سوٹ کیس کھینچ کر وہاں لے آئے جہاں ہم کھڑے تھے اور اسے کھول لیا۔ کاغذ، نوٹ بکیں، پنسلیں، پینٹس، آئل اور واٹر کلرز، برش اور پھر تصاویر اور پورٹریٹس...... دیہاتی لوگوں کی بہت سی پورٹریٹس، تصاویر جو کہ ایکس رے فلموں کو بلیڈ سے کاٹ کر تیار کی گئی تھیں۔ وہ ان سب کے بارے میں کافی دیر بتاتے رہے۔ ہم بشمول وارڈرز اور چیف وارڈر کے سنتے رہے اور تھوڑی دیر بعد رجسٹرار اور پھر گورنر وہاں پہنچ گئے۔

ان کی موجودگی میں ناظم حکمت نے وہ خصوصی انداز اپنایا جو وہ تقریباتی مواقع پر اپناتے تھے۔ ان سے متاثر یا مغلوب ہوئے بغیر رسمی برتاؤ کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہ ان کی جانب گھومے اور بار بار ''مائی ماسٹر، مائی ماسٹر'' کی تکرار کرتے ہوئے اپنی تشریحات دوبارہ شروع

کر دیں۔ آخر کار رجسٹرار اور گورنر ناظم کو وہیں اپنی پینٹنگز کے بارے میں باتیں کرتے ہوئے چھوڑ کر واپس اپنے دفتروں میں چلے گئے۔

"......اور یہ کمال طاہر ہے......اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ مستقبل کا ایک باکمال ترک ناول نگار ہے......" پھر انہوں نے ایک اور پورٹریٹ اٹھالی۔

"......وہ انہیں "عصمت دی ماڈرن" کہتے ہیں۔ وہ جانکیری جیل کا فوٹو گرافر تھا......"

پھر ایک اور پورٹریٹ۔ ایک دیہاتی نوجوان باہر کو نکلے کانوں، بڑی بڑی آنکھوں اور گنجے سر کے ساتھ۔

"اس کا نام "عصمت ہیڈ ہنٹر" ہے......یہ کمال طاہر کی ایک اہم مختصر کہانی کا ہیرو ہے۔"

وہ سنجیدہ ہو گئے۔ "ہمارے ترک لوگ حقیقت میں بہت زیرک ہیں!"

O

اس وقت عزت کے ساتھ میری بول چال بند تھی۔ ہمارا کسی معمولی سی بات پر جھگڑا ہو گیا تھا اور میں نے چیف وارڈر سے کہا تھا کہ وہ مجھے کسی اور وارڈ میں بھیج دے۔ اس نے مجھے جیل کے اسی سیکشن کے اوپر قید تنہائی والی کال کوٹھڑیوں میں سے ایک کوٹھڑی (سیل) دے دی تھی۔ یہاں ایسی چند کوٹھڑیاں ایک قطار میں بنی ہوئی تھیں اور وہ قیدی جو جیل کے قوانین کی خلاف ورزی (جوا کھیلنا، کسی کو خنجر یا چاقو گھونپنا یا چوری وغیرہ) کرتے تھے انہیں وہاں بند کر دیا جاتا اور پراسیکیوٹر آفس کی مقرر کردہ تاریخ تک اسے وہاں قید تنہائی میں رکھا جاتا تھا۔

میرا خیال ہے کہ ناظم کے آنے سے ایک ہفتہ بھر قبل میں کوٹھڑی نمبر 52 میں منتقل ہوا تھا اور انہوں نے میرے سامنے والی قطار میں سے دو کوٹھڑیاں ہٹ کر ایک کوٹھڑی ناظم کے لیے تیار کی تھی۔

نجاتی، امین بے اور میں نے ناظم کا گدا، سوٹ کیس اور ٹوکری اٹھا کر اور اپنے کندھوں پر رکھ لیے، اور وہ کچھ چیزیں ان کے اٹھانے کے لیے چھوڑنے کی درخواست کرتے ہوئے ہمارے پیچھے پیچھے چل پڑے۔ ہم شورزدہ اور بساند والی تاریک راہداریوں سے ہوتے ہوئے ایک کے بعد دوسرے آہنی دروازے سے گزرتے ہوئے سیڑھیاں نیچے اترے پھر دوبارہ

سیڑھیوں پر چڑھے۔ راہداریوں میں ہمارے دونوں جانب اپنے پژمردہ اور سنجیدہ چہروں کے ساتھ ایک ایک، دو دو اور تین تین قیدی آگے پیچھے جاتے ہوئے گزر رہے تھے۔ ہم نے ان کا سامان ان کی کوٹھڑی میں رکھا اور پھر ہم سب میری کوٹھڑی میں اکٹھے ہو گئے۔

اس سارے عرصے میں ناظم باتیں کرتے رہے تھے۔ وہ چانکیری کے بارے میں، جیل کے بارے میں، جیل انتظامیہ کے بارے میں، کمال طاہر کے بارے میں، خاص طور پر کمال طاہر سے اپنی دوستی کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔

آخرکار تمام لوگ چلے گئے اور صرف نجاتی، ناظم اور میں رہ گئے۔ پھر بغیر کسی تمہید کے نجاتی نے کہا، ''استاد، اس نے واقعی کچھ بہت اچھی نظمیں لکھی ہیں۔'' میں سٹپٹا اٹھا اور نجاتی کو بدگمان نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا، ''نہیں، نظمیں نہیں، محض ٹامک ٹوئیاں ماری ہیں۔'' نجاتی نے ترکی بہ ترکی طنزاً جواب دیتے ہوئے کہا، ''ہمیں تو تم یہی کہتے رہے ہو، کیا ایسا نہیں تھا۔''

سچی بات تو یہ ہے کہ میں اپنی نظموں کی خود ہی تعریف کرتا تھا۔ میں ان پر تکیہ کیے ہوئے تھا، اور بڑی امیدیں باندھ رکھی تھیں۔ ناظم کی آمد سے پہلے میں اس جیل کا عظیم ترین شاعر تھا۔ جی ہاں، باوجود عزت کے، باوجود نجاتی کے، میں یہی سمجھتا تھا۔

''تم انہیں ٹامک ٹوئیاں کیوں کہہ رہے ہو۔'' انہوں نے کہا، ''تم انہیں پڑھو، ہم سنیں گے۔''

دوپہر کے کھانے کا وقت ہو گیا تھا۔ میں اٹھا اور اپنی کوئلوں کی انگیٹھی جلائی۔ میں نے دو آدمیوں کے لیے کھانا تیار کیا۔ کھانا ''سجوک'' (Sucuk) اور انڈوں پر مشتمل تھا۔ (سجوک، گوشت کے قیمے عام طور پر گائے وغیرہ کے گوشت، کو اس کی اپنی چربی میں لہسن اور مصالحوں کے ساتھ بھون کر تیار کیا جاتا ہے)۔ ہم ایک ہی برتن سے اپنے چھوٹے کانٹوں کے ساتھ سجوک اور انڈے کھانے کی ابھی تیاری ہی کر رہے تھے، جب ناظم نے اعتراض کیا اور علیحدہ برتن میں کھانے کا کہا۔ کھانے کو دو برابر حصوں میں تقسیم کرنے کے بعد انہوں نے وضاحت کرنا شروع کی کہ انہوں نے ایک ہی برتن میں کھانے پر کیوں اعتراض کیا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ وسطی اناطولیہ کے دیہاتوں میں خارش کی بیماری اسی بری عادت کی وجہ سے پھیلی تھی۔ جب ہم کھانا کھا چکے تو

انہوں نے پوچھا، ''تم کھانے کی اشیاء کہاں سے لیتے ہو؟''

''جیل کی دکان سے۔'' میں نے جواب دیا، ''میرے پاس ایک چھوٹی سی نوٹ بک ہے۔ میں ادھار لیتا ہوں اور دکان دار رقم میری اس نوٹ بک میں درج کر دیتا ہے اور مہینے کے آغاز میں جب میرے والد رقم بھیجتے ہیں تو میں ادائیگی کر دیتا ہوں۔''

انہوں نے اپنا چھوٹا سا پرس نکالا اور پوچھا، ''مثال کے طور پر ان انڈوں اور بجوک پر کتنا خرچ آیا ہے؟''

''آپ یہ کیوں پوچھ رہے ہیں؟''

وہ بہت سنجیدہ ہو گئے۔ ''میں ان اخراجات میں حصہ ڈالنا چاہتا ہوں!'' انہوں نے اپنے پرس میں سے ڈھائی لیرا کا نوٹ نکالا جس کو بڑی احتیاط سے آٹھ تہیں دی گئی تھیں۔

میں نے ان سے صرف اس دن کے لیے اپنا مہمان بننے کی درخواست کی۔

''یہ ڈھائی لیرا کا نوٹ میری واحد دنیاوی دولت ہے۔'' انہوں نے کہا، ''اگر تم پسند کرو تو آج کی طرح میں تمہارے نوٹ بک میں درج اخراجات میں حصہ دار بن جاتا ہوں اور مہینے کے شروع میں......''

''یہ بہت اچھی بات ہے۔''

میں ان لوگوں کے ساتھ جن کے ساتھ میری پہلی بار ملاقات ہوئی ہو اور خاص طور پر جو شہرت کے مالک ہوں سکون یا ہم آہنگی محسوس نہیں کرتا۔ اس کی وجہ بڑی واضح ہے۔ لیکن میں اب بھی حیران ہوں کہ میں کس طرح پہلے روز ہی سے ناظم حکمت کے ساتھ اس قدر گھل مل گیا تھا کہ مجھے اس کا احساس ہی نہیں ہو سکا۔

آپ ان سے باآسانی باتیں کر سکتے ہیں، آپ اپنے آپ کو بڑے سکون میں محسوس کرتے ہیں......

''...... تمہیں شاید علم نہ ہو، میں تنہا رہنا بالکل پسند نہیں کرتا۔ اگر تم حکام سے اجازت لے لو، تو میں تمہارے ساتھ اس کوٹھری میں رہ سکتا ہوں......'' انہوں نے یہ بات قدرے جھجکتے ہوئے کہی، گویا کہ انہوں نے مجھے کوئی حکم دیا ہو، یا مجھے کسی مشکل صورت حال میں ڈال دیا ہو، یا

جیسے انہوں نے کوئی ایسی بات کہہ دی ہو جس نے مجھے ناقابل برداشت حد تک پریشان کر دیا ہو۔

''اگر آپ واقعی ایسا چاہتے ہیں، اور وہ کوئی اعتراض نہیں کرتے......''

وہ بہت خوش ہو گئے۔

''میں تمہارا رہنا بالکل برداشت نہیں کر سکتا! تم سوچ بھی نہیں سکتے...... میں ایک لفظ بھی نہیں لکھ سکتا۔ میں بالکل پاگل ہو جاتا ہوں......''

وہ کھڑے ہوئے اور اجازت لینے چلے گئے۔ اس وقت گورنر دوپہر کے کھانے کے بعد ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ لہٰذا ناظم بعد میں دوبارہ گئے اور ان سے میری کوٹھڑی (یا سیل) میں ٹھہرنے کی اجازت طلب کی۔ گورنر نے رجسٹرار اور چیف وارڈر سے بات کی اور پھر اجازت دے دی۔ ناظم واپس آ گئے۔

''اوہ، میرے بھائی!'' انہوں نے کہا، ''دروازے ہی دروازے اور تالے ہی تالے، ایڈمن یونٹ جانا تو بہت تکلیف دہ امر ہے۔ اوہ خدایا! یہ کتنے دروازے ہیں جن میں انہوں نے ہمیں بند کر رکھا ہے؟''

ان سے پہلے میں بھی اس بات پر حیران ہوا تھا اور میں نے ان کی گنتی کی تھی۔

''چھے۔'' میں نے کہا۔

انہوں نے ایک لمبی سیٹی کی آواز میں جواب دیا۔ ''فیوووو!''

اس ''فیوووو'' کی آواز نکالنے تک ناظم کو جیل میں آئے دو گھنٹے بیت چکے تھے۔ ان دو گھنٹوں میں نے ان سے واحد کے مانوس صیغے میں باتیں کرنا شروع کر دی تھیں اور میں ان کے بارے میں، ان کے نزدیکی اور پیاروں کے بارے میں، ان کی والدہ، ان کی بیوی، ان کے بیٹے، ان کی ہمشیرہ، ان کے بہنوئی، جو کہ ان کے چچا کا بیٹا بھی تھا، ان کے بھتیجوں اور بھتیجیوں اور بہت سے دوستوں کے بارے میں بہت کچھ جان چکا تھا۔ یہ سب کچھ کیسے ہو گیا، میں نہیں جانتا۔ میرا خیال ہے اس کو سمجھنے کے لیے آپ کو ناظم کے مکمل خلوص کا تجربہ کرنا ہوگا کیوں کہ ناظم ایک ایسے انسان ہیں جن سے ان کے دشمن بھی محبت کرتے ہیں۔

O

میں اس سوال سے خوف زدہ تھا، جو آخرکار انہوں نے پوچھ ہی لیا۔

''تمہاری تعلیم؟''

میں شرمندگی سے گنگ ہو گیا۔ جب بھی کوئی مجھ سے یہ بات پوچھتا تھا تو میں اس قدر شرمندہ ہو جاتا تھا کہ میں چاہتا تھا کہ زمین پھٹ جائے اور مجھے نگل لے۔ میں ''سرٹیفکیٹ'' کے بارے میں بتاتا تھا (وہ طالب علم جو تعلیم مکمل کیے بغیر سکول چھوڑ دیتے تھے ان کو سکول کی جانب سے ایک سرٹیفکیٹ مل جاتا تھا کہ وہ اتنے سال سکول آتے رہے ہیں)۔ ظاہر ہے اب بھی میرا یہی جواب تھا۔ لیکن ناظم کا ردعمل مختلف تھا، انہوں نے دوسرے لوگوں کی طرح منہ بنا کر حقارت کا اظہار نہیں کیا تھا۔

''کوئی بات نہیں، اس کی کوئی اہمیت نہیں۔'' انہوں نے کہا، ''اگر تم نے سرکاری نوکری کرنے کا منصوبہ نہیں بنا رکھا...... ذاتی طور پر میں اس کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔''

''............!''

''کیا تم کوئی غیر ملکی زبان بھی جانتے ہو؟''

''تھوڑی بہت فرانسیسی۔''

''کیا تم اسے بہتر کرنا چاہتے ہو؟''

''بالکل کرنا چاہتا ہوں......''

''بہت خوب...... چلو اب حالاتِ حاضرہ کے بارے میں کچھ بات چیت کرتے ہیں...... مثلاً اس جنگ کے بارے میں۔ یہ دوسری عالمی جنگ کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ جرمنی کی ان جارحانہ کارروائیوں کی کیا اہمیت ہے؟''

میں نے ایک لمبی وضاحت پیش کی۔

''ٹھیک ہے، تمہارے بعض نکات یقیناً درست ہیں...... لیکن......''

انہوں نے ایک اور سوال پوچھا۔

''جب میں لفظ ''فلسفہ'' کہتا ہوں تو تم کیا سمجھتے ہو؟''

میں ''فلسفہ'' پر ترکی زبان میں لکھی ہوئی بہت سی کتابیں پڑھ چکا تھا اور ''فلسفے'' کی

بہت سی تعریفیں زبانی یاد تھیں۔ میں نے یکے بعد دیگرے یہ ساری بیان کر دیں۔

وہ میری باتیں سنجیدگی سے سنتے رہے۔ "صاف نظر آ رہا ہے کہ تمہارا مطالعہ کافی وسیع ہے۔" انہوں نے کہا۔ پھر وہ کہنے لگے، "تمہاری نظمیں؟"

میں دوبارہ گھبرا گیا، میرا سر گھوم رہا تھا۔

"وہ انتہائی ناپختہ نظمیں ہیں......"

"کوئی بات نہیں، لے کر آؤ، ان پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔"

شاعر کے طور پر میری مہارتیں ایک بڑے سخت امتحان سے گزرنے والی تھیں۔ میں اٹھا اور اپنے سوٹ کیس سے اپنی نظمیں نکال کر لے آیا۔ انہوں نے اپنے پائپ میں تھوڑا سا تمبا کو بھرا، چند کش لے کر دھواں چھوڑا اور بڑی سنجیدگی سے کہا، "ٹھیک ہے، میں سن رہا ہوں۔"

میں نے پڑھنا شروع کر دیا۔

یہ نظمیں ارکان کی تعداد پر مبنی بحر میں لکھی گئی تھیں۔ وہ ایسی نظمیں تھیں جن میں میں نے اپنے ابھرتے ہوئے جذبات کو سیدھے سادے انداز میں اور خلوص کے ساتھ پیش نہیں کیا تھا۔ میں نے ان کو ان شاعروں کے جذبات کی صورت دینے کی کوشش کی تھی جو "الوہی القا" کے دعوے دار ہوتے ہیں۔ اور میں نے انہیں مزاحیہ انداز میں پڑھا تھا، جیسا کہ وہ کرتے ہیں......

میں پہلے بند کے ابھی اختتام تک بھی نہیں پہنچا تھا......

"اتنا بہت ہے، میرے بھائی، یہ کافی ہے...... اب ذرا دوسری نظم پڑھو۔"

یہ ان نظموں میں سے تھی جن کو میں حقیقی طور پر بہت عمدہ خیال کرتا تھا۔ میرے اندر کوئی چیز کرچی کرچی ہو کر بکھر گئی۔

دوسری نظم...... میں نے پہلا مصرعہ پڑھا، پھر دوسرا اور تیسرے مصرعے کے درمیان ہی: "انتہائی بیزار کن!"

میرا خون کھول رہا تھا، سر گھوم رہا تھا، اپنے آپ کو بہت حقیر محسوس کر رہا تھا۔

پھر ایک اور نظم......

"بھیانک!"

میری آنکھیں جل رہی تھیں...... کیا میں غصے میں تھا؟ میری تیسری نظم، میں نے ابھی پہلے دو مصرعے ہی پڑھے تھے۔

"چلو چھوڑو...... میرے بھائی، اس لفاظی کا کیا فائدہ، بغیر کسی ٹھوس اظہار کے محض بے معنی جملے اور مصرعے۔ تم ان چیزوں کے بارے میں کیوں لکھتے ہو جنہیں تم حقیقت میں اور دل کی گہرائیوں سے محسوس نہیں کرتے۔ دیکھو تم ایک معقول انسان ہو۔ تم اچھا خاصا فہم رکھتے ہو۔ کیا تمہیں اس بات کا شعور نہیں کہ جب تم کسی ایسی چیز کے بارے میں لکھتے ہو جسے تم اس طرح سے محسوس نہیں کر رہے ہوتے جس طرح تم بیان کر رہے ہوتے ہو، تو تم خود اپنے آپ کو بدنام کر رہے ہوتے ہو اور یہ کہ تم اس چیز کا مضحکہ اڑا رہے ہوتے ہو؟"

میرا سارا خون نچڑ کر میرے پیروں میں آ گیا اور میری "نظمیں"...... جو محض کاغذوں کا ایک پلندہ تھیں...... فرش پر ایک ڈھیر کی صورت میں گر گئیں۔ میں نے سانا بند کر دیا۔ میں نجاتی اور عزت کو اپنے سامنے بیٹھا تصور کر سکتا تھا...... اور سب سے بڑھ کر ناظم کو...... میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ نجاتی اور نہ ہی عزت وہاں موجود تھے۔

ناظم حکمت نے بولنا بند نہ کیا...... حقیقت میں وہ مجھے ایک لمبا لیکچر دے رہے تھے، جس میں حقیقت نگاری اور فعال حقیقت نگاری جیسے الفاظ بار بار آ رہے تھے، سیدھی بات تو یہ ہے کہ ان کی ساری گفتگو کا ایک لفظ بھی میرے پلے نہیں پڑ رہا تھا۔ میرے اندر کی پوری دنیا ٹوٹ پھوٹ چکی تھی، دنیا جو کہ ناقص اور کمزور بنیادوں پر قائم تھی، غلط فہمی پر مبنی نظریات سے تشکیل پائی ہوئی دنیا، وہ نظریات جن کی سچائی پر خود مجھے بھی یقین نہیں تھا، اور جعلی اعتقادات جن کو ترک کرنے کی ضرورت تھی۔

"کیا اب تم میری نظمیں سننا پسند کرو گے؟"

میں نے اپنے حواس کو بحال کیا۔ ہم آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ایک دوسرے کے سامنے تھے۔ انہوں نے مزید کہا، "لیکن تمہیں مروت سے کام نہیں لینا ہوگا! تم بھی تنقید کرو گے، بغیر کسی ہچکچاہٹ کے۔"

انہوں نے سب سے پہلے "نگار اور مصطفیٰ" پڑھی، جب کہ میری توقع یہ تھی کہ وہ

"The Son of the Kadi of Simavna" ،"Weeping Willow" ،"The Caspian Sea" یا"Taranta-Babu" کے کچھ مصرعے سنائیں گے۔ وہ جو سنا رہے تھے وہ ان سب سے مختلف انداز کا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ عام، سادہ اور ایک دوسرے سے پیوست الفاظ پر مشتمل مصرعے خود بخود پھسلتے آ رہے ہوں۔ میں انہیں سن کر اپنے آپ میں بڑبڑا رہا تھا،''...... یہ تو کوئی بات نہیں...... اس جیسا تو میں بھی لکھ سکتا ہوں......!'' میں نے اپنے اندر اس انداز میں لکھنے کی خواہش کو انگڑائیاں لیتے ہوئے اور خود اعتمادی کو بحال ہوتے ہوئے محسوس کیا جو کہ کچھ دیر پہلے غیر معمولی طور پر ہوا ہو چکی تھی۔

وہ پڑھ رہے تھے۔ سیاہ جلد والی چھوٹی سی نوٹ بک کے صفحات آگے پیچھے الٹتے جا رہے تھے۔ اس دوران وہ گاہے بگاہے بعض چیزوں کی وضاحت کے لیے رک جاتے تھے۔ انہوں نے مجھے بتایا،''یہ اس نظم کے مختلف حصے ہیں جو میں نے چانکیری جیل میں تحریر کیے تھے۔''

وہ تعداد میں اتنے زیادہ ہیں جتنی زمین پر چیونٹیاں

پانی میں جتنی مچھلیاں

فضا میں جتنے پرندے

وہ بزدل

دلیر

بے علم

غالب ہیں

اور وہ بچے ہیں

اور وہ جو تباہ کرتے ہیں

اور وہ جو تخلیق کرتے ہیں

یہ وہ ہیں

ہاں، یہ مختلف تھی۔ بہت زیادہ مختلف۔ اس میں ایک اظہار تھا، ایک ایسی عظمت تھی جو آپ کو مقدس صحیفوں کی یاد دلاتی تھی۔

اچانک مجھے کسی کے الفاظ یاد آئے "835 مصرعے' جو خوف زدہ تھے کہ شاعر دہرانا شروع کر دے گا"، اور میں نے ان سے پوچھا:

"......آپ کیا کہتے ہیں؟"

وہ محض مسکرا دیے۔ انہوں نے اپنی نوٹ بک بند کر دی، ایک گہرا سانس لیا اور پھر پوچھا: "تمہیں میری نظمیں کیسی لگیں؟"

"بہت عمدہ! انتہائی شان دار!" میں نے جواب دیا۔

انہوں نے مجھے مشکوک نظروں سے دیکھا۔

"نہیں! تم مروت سے کام لے رہے ہو۔"

انہوں نے اپنے پائپ کو جھنجلاہٹ کے ساتھ ہلایا اور نوٹ بک کو سوٹ کیس میں رکھ دیا۔

"یقینی طور پر تمہارے اندر ایک اچھا ادیب بننے کی صلاحیت موجود ہے۔" انہوں نے کہا، "میں نے ابھی کچھ دیر پہلے تمہاری شاعری کے بارے میں قدرے زیادہ سخت رویہ اپنایا تھا......لیکن میں معافی چاہتا ہوں کیوں کہ جب لکھنے کے فن پر بات ہو رہی ہو تو میں بہت سنجیدہ ہو جاتا ہوں......یہی وجہ ہے کہ...... ہاں، تمہارے اندر وہ صلاحیت موجود ہے جو ایک اچھا ادیب بننے کے لیے ضروری ہے......"

انہوں نے ایک جماہی لی، اپنے تاثرات میں نرمی پیدا کی......اور انہوں نے دوبارہ اپنا پائپ بھرا، اسے دیا سلائی دکھائی، چند کش لیے اور دھواں چھوڑتے ہوئے کہا:

"کیا میں کوئی مشورہ دے سکتا ہوں؟"

"کیوں نہیں۔"

"میں تمہیں اپنی نگرانی میں لینا چاہتا ہوں......میرا مطلب تمہاری تعلیم ہے......ہم باقاعدگی سے سبق پڑھیں گے......پہلے فرانسیسی، پھر دوسرے مضامین......کیا تم اسے کامیابی سے انجام دے پاؤ گے؟"

"جی ہاں!"

"تم اس بات کا وعدہ کرو۔"

''میں وعدہ کرتا ہوں۔''

انہوں نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ میں نے ان کے ہلکی جھریوں والے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ میں نے ان کی پتلی دبلی اور نازک کلائی پر نگاہ ڈالی۔

''بغیر تنگ آئے، بغیر تھکے یا بغیر اکتائے؟''

''جی ہاں! بغیر تنگ آئے، بغیر تھکے یا بغیر اکتائے۔''

''منظور؟''

''منظور!''

''بالکل ٹھیک ہے۔ اب بات پکی......''

انہوں نے دوبارہ اطمینان کے ساتھ اپنا پائپ دانتوں میں داب لیا۔

III

دن گزرتے گئے۔ موسم سرد تھا اور آسمان سرمئی بادلوں سے ڈھکا رہتا تھا۔ کبھی کبھار بادلوں کو چیرتے ہوئے دھوپ کی روشن شعاعیں زمین تک پہنچ جاتیں...... ان دنوں ہم جیل کے باغیچے میں برف کی تہہ پر چہل قدمی کیا کرتے تھے۔ ناظم کہنے لگے، "اس جیل میں خوف ناک سیلن ہے۔ یہ بہت بری بات ہے کہ ہم مناسب ورزشیں نہیں کرتے۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں ہر روز صبح باقاعدگی سے ورزش کرنی چاہیے۔"

انہوں نے چند روز ورزش کرنے کی کوشش کی۔ وہ ننگے بدن بنیان پہن کر جیل کے باغیچے میں برف پر ورزش کرتے رہے۔ چند روز ورزش کرنے کے بعد انہوں نے خود ہی چھوڑ دی۔

"ہمارے لوگ ایسے کاموں کو خبط خیال کرتے ہیں۔ وہ ان سے مانوس نہیں ہیں۔ ہمیں اس انوکھے انداز کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے۔"

سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے ان کے اس فیصلے سے بہت اطمینان ہوا...... میں نے ناظم سے کبھی بات نہیں کی تھی، لیکن میں نے جیل میں بہت سے لوگوں کو ان کی اس حرکت کے بارے میں چہ میگوئیاں کرتے اور تمسخر اڑاتے سنا تھا۔

میں ہر روز سات سے آٹھ گھنٹے بعض اوقات اس سے بھی زیادہ پڑھتا تھا۔ میں ان کی نظموں جیسی نظمیں بھی لکھتا تھا، لیکن ابھی تک مجھ میں یہ نظمیں انہیں دکھانے کی ہمت پیدا نہیں ہو رہی تھی۔ ان کی نظمیں کتنی بے عیب تھیں، کس طرح صرف چند الفاظ میں وہ بہت کچھ بیان

کر دیتے تھے! اور ان کے برعکس میری نظمیں کتنی بے رس اور تاثیر سے خالی ہوتی تھیں، جیسے آپ مچھلی کے کانٹوں سے بھری ہوئی کوئی چیز نگل رہے ہوں...... یہ ایسی ہی اکثر ہوتی تھیں۔

کئی مہینوں کے بعد اپنی پہلی نظم جو میں نے انہیں دکھائی وہ "بیروت کی ایک کہانی" تھی۔

"چلو پڑھو! اسے سنتے ہیں۔" انہوں نے کہا۔

قدرے سنبھل کر میں نے محتاط انداز میں پڑھنا شروع کیا:

میں بیروت میں ہوں
"نیو استنبول ریستوران" میں
گندے برتنوں کے ڈھیر کے پاس کھڑا
میں اٹھارہ سال کا ہوں۔
میرے بال نفاست سے آراستہ اور چمک دار ہیں
میں ایلینی کے بارے میں سوچ رہا ہوں

انہوں نے بڑے تحمل سے آخر تک میری نظم سنی، ان کا پائپ دوبارہ ان کے دانتوں تلے تھا۔ پھر انہوں نے کاغذ کا وہ ٹکڑا جس سے میں پڑھ رہا تھا میرے ہاتھ سے اچک لیا، اس پر ایک نظر ڈالی اور مجھے واپس کر دیا۔

"اسے دوبارہ پڑھو!"

جب میں اسے دوسری مرتبہ پڑھ رہا تھا، انہوں نے کہا "رکو۔" انہوں نے مجھے کچھ الفاظ کاٹنے، یا خاص مصرعے کو اور اس کے بعد کے مصرعے کو نظم کے شروع میں رکھنے اور پہلے مصرعے کو نظم کے اختتام پر رکھنے کو کہا۔

جب میری نظم کی کاٹ چھانٹ ہو رہی تھی، میں دیکھ رہا تھا کہ میری بے رس اور خشک نظم میں سے ایک نئی "نظم" جنم لے چکی تھی جو اُن کی نظموں کی یاد دلاتی تھی۔

وہ میری نیم دانشوری اور میرے متوسط طبقے کے پس منظر سے جنم لینے والی میری من

مینخ نکالنے والی فطرت سے لے کر میری بعض مخصوص عادات اور نظریات تک میرے ہر پہلو کا بڑی باریک بینی سے جائزہ لیتے ہوئے اپنا بہت زیادہ وقت مجھ پر صرف کر رہے تھے۔

نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ جب سے میری ناظم سے دوستی ہوئی تھی اور ان کے ساتھ ایک ہی کوٹھڑی میں رہنا شروع کیا تھا، میں نے عزت اور نجاتی کو تقریباً مکمل طور پر نظر انداز کر دیا تھا۔ خیر عزت سے تو میری بول چال پہلے ہی سے بند تھی لیکن نجاتی سے تو کوئی ایسا معاملہ بھی نہ تھا۔

کچھ عرصے کے بعد عزت کے ساتھ صلح ہو گئی اور ہم دوبارہ دوست بن گئے۔ ایک دن کنکریٹ کی ایک راہداری کے کونے میں ناظم کی نظروں سے بچتے ہوئے میں نے عزت کو اپنی دو نظمیں سنائیں جن کو ناظم نے کاٹ چھانٹ کرنے کے بعد ایک نئی شکل دے دی تھی۔ عزت بھی اپنے آپ کو اتنا ہی شاعر خیال کرتا تھا جتنا کہ میں اپنے آپ کو۔

وہ میری نظمیں سننے کے بعد کبیدہ خاطر نظر آ رہا تھا۔

"کیا یہ تم نے خود لکھی ہیں؟"

"ظاہر ہے......" میں نے جواب دیا۔

اپنے ہونٹوں کو سکیڑتے ہوئے اس نے اپنا چہرہ دوسری طرف موڑ لیا، اس کے بال لوشن سے چمک رہے تھے اور قرمزی رنگ کے نظر آ رہے تھے۔ "میں بھی...." اس نے کہا، "میں بھی ناظم سے دوستی کروں گا۔"

میں نے بہت جھلاہٹ محسوس کی۔ میں نے اسے ناظم کے بارے میں نجاتی کے الفاظ یاد کرائے، "پریشان ہوتے اور اپنا بوریا بستر لپیٹتے ہوئے......" لیکن اس نے کوئی اثر نہ لیا۔

"میں بھی انہیں اپنی شاعری دکھاؤں گا۔ میں بھی انہیں اسے درست کرنے کے لیے کہوں گا۔" وہ یہ بات مسلسل دہراتا چلا گیا۔

ہم اسی تلخ مزاجی میں جدا ہو گئے۔

میں سیدھا نجاتی کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ جب وہ مجھے مل گیا، میں نے اسے بھی اپنی نظمیں پڑھ کر سنائیں۔ اس نے انہیں بہت پسند کیا اور کہا:

''لیکن، یہ تمہاری نظموں جیسی بالکل نہیں...... کیا ناظم حکمت نے ان کی اصلاح کی ہے۔''

میں نے موضوع کو تبدیل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا،''ہاں یاد آیا...... عزت کہتا ہے...... لیکن تم نے کہا تھا کہ وہ پیچھے پڑ جانے والوں کو پسند نہیں کرتے؟''

نجاتی نے کوئی جواب نہ دیا۔ لیکن اس دن کے بعد نجاتی اور عزت دونوں اپنی شاعری کے پلندوں کے ساتھ وہاں آنے لگے۔

ناظم نے ان کی نظمیں بڑے غور سے سنیں لیکن انہوں نے ''بیزار کن'' یا ''بھیانک'' یا ''لچر'' جیسے الفاظ نہ کہے جو انہوں نے میری نظموں کے بارے میں کہے تھے بلکہ وہ وقفے وقفے سے کہہ رہے تھے،''بہت خوب! عزت'' یا ''یہ مصرعہ بہت خوب صورت ہے۔'' عزت اپنے لوشن سے چمکتے ہوئے بالوں کے ساتھ میری جانب فخریہ انداز میں دیکھتا۔

ایک ایسے ہی روز جب وہ عزت اور نجاتی کی نظمیں سنتے رہے تھے، ان کے جانے کے بعد میں نے پوچھا:

''کیا آپ سچ مچ انہیں پسند کرتے ہیں؟''

انہوں نے مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔''ظاہر ہے......'' انہوں نے کہا۔

میں منہ بنائے بغیر نہ رہ سکا۔

پھر میں نے ایک روز کہا،''دیکھو استاد، آپ نجاتی کے حق میں اچھا نہیں کر رہے۔ اس نے پرائمری بھی مکمل نہیں کیا۔ وہ سمجھتا ہے کہ وہ واقعی ہی ایک شاعر ہے۔ لیکن......''

انہوں نے بڑے ٹھنڈے مزاج سے پائپ کے دھوئیں کا مرغولا چھوڑتے ہوئے کہا:

''تو کیا ہوا؟''

''لیکن وہ کسی کی کوئی پرواہ نہیں کرتا۔ وہ محض یہ کہتا پھرتا ہے کہ ناظم حکمت اس کی شاعری کو اعلیٰ تسلیم کرتا ہے۔''

''اسے کہنے دو۔''

''اسے کہنے دو؟ کیا آپ حقیقتاً جان بوجھ کر ایک شخص کو اس طرح نقصان پہنچا سکتے ہیں؟''

''میں اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا رہا۔''

''اگر وہ سمجھے گا کہ وہ پہلے سے ہی بہت عمدہ شاعر ہے تو وہ اپنے آپ کو بہتر بنانے کے لیے کبھی بھی پڑھنے کی تکلیف نہیں اٹھائے گا۔''

انہوں نے میری جانب گھور کر دیکھا اور پھر ہنس پڑے۔

''میں جانتا ہوں......!''

پھر وہ کوٹھڑی سے باہر نکل گئے۔

میں وہاں کوٹھڑی میں ہی رکا رہا۔ مجھے ہر شخص پر اور ہر چیز پر بہت غصہ اور طیش آ رہا تھا۔ مجھے ساری دنیا تاریک ہوتی نظر آ رہی تھی۔ حتیٰ کہ میں نے پڑھائی وغیرہ اور اس سب کچھ کو خدا حافظ کہنے اور اس کوٹھڑی کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے اپنی کتابیں اور کاپیاں ایک طرف رکھ دیں۔ میں اب پڑھنا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے ان باتوں کی ضرورت نہیں تھی جو وہ مجھے سکھانا چاہتے تھے۔

'''میں جانتا ہوں......!' اونہہ!''

بدمزگی اور بدمزاجی کی کیفیت میں، مَیں کھڑکی میں جا بیٹھا اور سامنے پہاڑوں کو دیکھنے لگا۔ میں ان کے الفاظ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ ''میں جانتا ہوں......'' ان کی نظموں کو پسند کرنا محض مجھے تنگ کرنے کے لیے تھا اور وہ احمق ان کی بات کو سچ تسلیم کر رہے تھے......ظاہر ہے وہ ایک لفظ بھی نہیں لکھ سکتے تھے، جو انہوں نے لکھا تھا وہ سیدھا سادہ اور بیزار کن تھا۔ میری کوئی ایک نظم بھی اگر ان کی تمام نظموں کو یکجا بھی کر دیا جائے تو اُن پر بھی بھاری تھی، '''میں جانتا ہوں......!' اونہہ!''

جیسے وہ کوٹھڑی سے باہر نکلے تھے ویسے ہی واپس آ گئے۔

''چلو آؤ۔'' انہوں نے کہا، ''کیا تم تیار ہو؟''

وہ میری فرانسیسی کو پرکھنا چاہتے تھے۔ میں نے کوئی دھیان نہ دیا۔ انہوں نے دہرایا:

''میں تم سے بات کر رہا ہوں!''

''میں تیار نہیں ہوں!'' میں نے کہا اور منہ دوسری جانب پھیر کر لاتعلقی کا مظاہرہ کیا۔

انہوں نے بالکل اصرار نہ کیا۔

''اچھی بات ہے۔'' انہوں نے کہا، ''چلو تم پھر تیار ہو جاؤ گے۔''

وہ کوٹھڑی سے باہر نکل گئے۔ بعد میں جب میرا غصہ ماند پڑ گیا تو انہوں نے دوبارہ پوچھا:

''کیا تم تیار ہو؟''

میں قدرے بڑبڑا کر رہ گیا، کچھ معذرتیں، کچھ وضاحتیں......

''ہم ایک ہی قبیل سے تعلق رکھتے ہیں۔'' انہوں نے کہا، ''میں تمہیں اتنا اچھی طرح جانتا ہوں جتنا میں اپنے ہاتھ کی لکیروں کو جانتا ہوں......''

پھر ایک دن انہوں نے ہم تینوں، عزت، نجاتی اور مجھے، چھے مصرعوں پر مشتمل ایک نظم دی۔

''مصرعوں کی ترتیب کو تبدیل کرو اور نظم کو بہترین ممکنہ صورت میں لے کر آؤ۔''

ہم میں سے ہر کوئی علیحدہ علیحدہ کونوں میں بیٹھ کر پورے انہماک کے ساتھ اپنی بہترین صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے، مصرعوں کی ترتیب کو تبدیل کرتے ہوئے نظم کو ''بہترین ممکن صورت'' دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہم پوری طرح جانتے تھے کہ یہ ایک امتحان تھا، ہم تینوں کے درمیان ایک مقابلہ۔

ہم میں سے ہر ایک نے مختلف ترتیب دی تھی۔ ہم تین رقیب، تینوں گھبراہٹ اور سراسیمگی کے عالم میں، تینوں ایک دوسرے کے لیے نفرت لیے ہوئے، ہماری نگاہیں ناظم پر مرکوز تھیں، کاغذ کے وہ اوراق جن پر ہم نے لکھا تھا، ہم نے انہیں تھما دیے۔

ناظم نے وہ اوراق تھامے، انہیں پڑھا، کافی دیر ان پر غور کیا۔ آخر کار انہوں نے کہا:

''اچھا ہے، یہ بہتر ہے، یہ بہترین ہے۔''

میں مقابلہ جیت چکا تھا۔

IV

اسی طرح ایک روز کہیں سے میرے ایک ناول کے ابتدائی اوراق ان کے ہاتھ لگ گئے۔انہوں نے وہ پڑھے۔اس وقت میں جیل کے صحن میں تھا۔وہ بہت زیادہ پُرجوش انداز میں اپنی کھڑاؤں میں بھاگتے ہوئے میرے پاس آئے۔اپنی اُکھڑی ہوئی سانسوں میں انہوں نے پوچھا: ''کیا یہ تم نے لکھا ہے؟''

میں نے ہچکچاتے ہوئے جواب دیا، ''ہاں......''

''میری بات سنو۔'' انہوں نے کہا، ''تم نے مجھے اس کے بارے میں کیوں نہیں بتایا؟ تمہیں نثر لکھنی چاہیے، ہاں نثر!''

میں بہت زیادہ حیران تھا......انہوں نے مجھ سے لمبی گفتگو کی اور پھر مجھے مختصر کہانیاں لکھنے کا مشورہ دیا۔ترک ادب میں، مختصر کہانیاں لکھنا ایک ایسی صنف تھی جس سے میں بہ مشکل ہی شناسا تھا۔میں اس کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا تھا، میں اس کے اصول وضوابط سے بالکل آگاہ نہ تھا۔

''یہ تو بہت اچھی بات ہے۔'' ناظم کہہ رہے تھے، ''اس طرح تم کسی دوسرے سے اثر انداز ہوئے بغیر خود اپنے انداز میں اپنی رائے کا اظہار کر سکتے ہو۔''

اب میں نے شاعری پر توجہ کم کردی تھی۔میری تعلیم وتربیت تیزی سے جاری تھی اور مختصر کہانیاں لکھنے کے لیے میری بنیادیں استوار ہو رہی تھیں۔

''مجھ سے پوچھو۔'' انہوں نے کہا،'' جو تمہارے ذہن میں آئے بلا جھجک پوچھو......
مناسب یا نامناسب، متعلقہ یا غیر متعلقہ، وقت یا بے وقت، جو چاہے پوچھو......''

''کیا فرائیڈ کا یہی مطلب تھا؟''

''اور سٹینڈ ہل، ژولا اور بالزاک......''

''............''

''............''

پھر ایک روز جب کہ موقع محل دیکھے بغیر میں نے ان سے یہ سوال کر دیا۔

''استاد، لوگ کہتے ہیں کہ جب آپ آزاد تھے، جیل میں نہیں تھے، آپ کسی قہوہ خانے میں جاتے، اس جگہ سب سے زیادہ غربت کا مارا شخص تلاش کرتے، اپنی جیب سے ساری رقم نکالتے اور پھر اس سے کہتے، اب تم بھی اپنے پیسے نکالو! وہ آدمی اپنے چند سکے باہر نکالتا، اور پھر آپ ساری رقم ایک جگہ جمع کرتے اور آپس میں برابر تقسیم کر لیتے۔''

وہ ہر لحہ بڑھتے ہوئے استعجاب کے ساتھ بڑی توجہ سے میری بات سنتے رہے، پھر اچانک بہت زیادہ غصے میں آ گئے۔ میں سمجھ رہا تھا کہ وہ مسکرائیں گے اور کچھ ایسے ہی مزید واقعات اور مثالیں سنائیں گے۔

''کبھی نہیں۔'' انہوں نے کہا،'' میں تمہیں حلفیہ یقین دلا سکتا ہوں کہ میں نے آج تک کبھی بھی ایسے اوچھے اور دکھاوے کے مظاہرے نہیں کیے۔''

پھر ایک دن میں نے ان سے ایک اور بات پوچھی۔

''کسی نے'' یانی (نیا) مجموعہ'' میں ایک مضمون لکھا تھا جس میں اس نے کہا تھا کہ ناظم اس قدر جاہل ہے کہ وہ فکرت کو نہیں سمجھ سکتا۔ مصنف نے یہ دعویٰ بھی کیا تھا کہ آزاد نظم آپ کی اپنی اختراع نہیں تھی بلکہ آپ نے اسے روسی شاعر'' مایا کووسکی'' سے مستعار لیا تھا۔''

میں نے یہ مضمون ناظم کو ملنے سے بہت پہلے پڑھا تھا۔ اب میں نے اس بارے میں ان سے استفسار کیا۔

''...... مایا کووسکی کے ٹکڑوں میں بٹے ہوئے مصرعے حقیقت میں کافی حد تک میرے

جیسے ہی ہوتے ہیں۔لیکن وہ عروضی بحر میں لکھتا ہے۔روی علم عروض کے مطابق۔۔۔۔جب کہ میرے مصرعے خالصتاً اثر اور ترنم کے حامل ہوتے ہیں۔'' پھر انہوں نے تفصیل سے روشنی ڈالنی شروع کردی۔

کس طرح جنگ آزادی کے دوران ولا نورالدین(Vala Nurettin) ، یوسف ضیا، فاروق نافذ اور وہ انقرہ کے لیے روانہ ہوئے۔انقرہ حکومت نے یوسف ضیا اور فاروق نافذ کو واپس بھیج دیا، فاروق نافذ کو سلطانوں کے قصیدے لکھنے پر اور یوسف ضیا کو......''

اس وقت اناطولیہ کی حالت زار اور اس کی شدید غربت نے ناظم پر گہرا اثر ڈالا۔وہ اس کے بارے میں لکھنا چاہتے تھے...... اس بارے میں کہنے کو بہت کچھ تھا لیکن علم عروض اور ارکان کی تعداد پر مبنی بحریں اس راستے میں رکاوٹیں ڈال رہی تھیں...... پھر یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ انہیں ان مقررہ اور متعین صورتوں سے نجات حاصل کرنی چاہیے اور شاعری کے دوسرے واسطے اپنانے چاہئیں، جو زیادہ آزاد، وسیع اور زوردار ہیں۔یا پھر انہوں نے شدت سے یہ محسوس کیا کہ ارکان کی تعداد پر مبنی بحریں اور عروضی بندشیں معمولی، سادے اور غیر اہم احساسات کو ظاہر کرنے کے لیے مناسب ہو سکتی تھیں لیکن وسیع اور تمام موضوعات کا مکمل احاطہ کرنے کے لیے رکاوٹ کا باعث بنتی ہیں۔

صرف چند ایک نہیں
صرف پانچ دس نہیں
تین کروڑ
بھوک سے مرتے ہوئے
وہ ہم میں سے ہیں!
وہ
ہم میں سے ہیں!
ہم
اُن میں سے ہیں!

بھوک سے مرتے ہوئے قطار میں کھڑے ہیں--- بھوک سے مرتے ہوئے

نہ مرد ہے نہ عورت، نہ لڑکا نہ ہی لڑکی

دبلے پتلے، نحیف ونزار

مڑے تڑے، ٹیڑھے میڑھے درخت

مڑی تڑی، ٹیڑھی میڑھی شاخوں کے ساتھ!

نہ مرد ہے نہ عورت، نہ لڑکا نہ ہی لڑکی

دبلے پتلے، نحیف ونزار

مڑے تڑے، ٹیڑھے میڑھے درخت

مڑی تڑی، ٹیڑھی میڑھی شاخوں کے ساتھ!

نہ مرد ہے نہ عورت، نہ لڑکا نہ ہی لڑکی

بھوک سے مرتے ہوئے قطار میں کھڑے ہیں--- بھوک سے مرتے ہوئے!

کچھ پیٹ رہے ہیں

اپنے گھٹنے

جو محض ہڈی ہی ہڈی ہیں

اور اُٹھائے ہوئے ہیں

اپنے پھولے ہوئے پیٹ!

کچھ ہیں محض

کھال --- کھال

صرف

ان کی آنکھیں زندہ ہیں!

یہ نظم ان جذبات کا اظہار ہے جن کا تجربہ ان کو پہلی مرتبہ غالباً اناطولیہ میں ہوا، اور پھر جب انقلاب کے بعد دریائے وولگا کے کناروں پر اُن کا سامنا بھوک اور غربت سے ہوا۔

اور پھر ماسکو میں............

"......کئی دنوں بلکہ کئی ہفتوں تک۔" اُنہوں نے بتایا، "میں نے نئے خیالات اور بیان کے لیے اسلوب کے ذریعے شاعرانہ اظہار کے امکانات کو وسعت دینے کے لیے محنت کی......"

پھر جب کہ وہ ابھی روسی زبان سے بالکل ناآشنا تھے، انہوں نے ایک روسی اخبار اٹھایا اور ان کی نظر ٹوٹی ہوئی سطروں پر پڑی، یہ خیال کرتے ہوئے کہ یہ ضرور کوئی نظم وغیرہ ہوگی انہوں نے اپنے ایک دوست کو ان سطروں کا ترجمہ کرنے کو کہا۔ وہ حقیقت میں کسی نظم کا ایک بند تھا جو کہ "مایا کووسکی" کی لکھی ہوئی تھی...... یہ ان کا اس شاعر سے پہلا تعارف تھا۔

ہر روز وہی در و دیوار، وہی چہرے، وہی کھڑکی اور اُسی کھڑکی سے نظر آنے والے وہی پہاڑ اور وہی اونچی نیچی پہاڑیاں...... چاروں سمت ایک ہی دنیا تھی، سوائے قدرت کے جو موسموں کے ساتھ تبدیل ہوتی رہتی تھی۔ اکثر میں کھڑکی کے پاس بیٹھ جاتا اور باہر کی دنیا کا نظارہ کرتا، دُور کہیں چلچلاتی دھوپ میں کوئی کسان سست روی سے ہل چلا رہا ہوتا یا کوئی نوجوان دیہاتی لڑکی کھیتوں میں بل کھاتی ہوئی پگڈنڈی پر دوپہر کا کھانا اٹھائے دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی چل رہی ہوتی۔

جیل میں سب سے زیادہ خوش گوار اور پرلطف دن اہم مذہبی تہوار عیدین اور ملاقات کے دن ہوتے تھے۔ لیکن تہوار خاص طور پر بہت پُررونق اور پُرہنگام ہوتے تھے...... بالکل باہر کی آزاد دنیا کی طرح یہاں بھی ہر کوئی نئے کپڑے یا کم از کم کچھ نہ کچھ نیا پہننے کی فکر میں ہوتا۔ اور تہوار سے پہلی شام کو وہ لوگ بھی جن کے پاس شاید ہی کوئی رقم ہوتی اپنے شیو یا حجامت بنوانے کے بعد حجام کے مددگار لڑکے کو کچھ نہ کچھ ٹپ ضرور دیتے اور پھر اسی خوشی کے جذبے میں جسے وہ بہ مشکل سنبھالے ہوتے خاموشی سے نکل جاتے۔ ان دنوں میں دشمن بھی آپس میں صلح جوئی کے جذبات لیے ہوتے...... زیادہ تر وہ لوگ جو سال کے گیارہ مہینے جوئے سے اور افیون، چرس اور ہر قسم کی ممنوعہ اشیاء بیچ کر پیسے بناتے تھے اور ان گیارہ مہینوں کے دوران ہر روز یہ سب کچھ کرنے کے لیے ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی فکر میں رہتے تھے، تہوار کے ان تین دنوں میں برادرانہ محبت

میں ڈوبے ہوتے تھے۔ سگریٹوں کی ڈبیاں نکال لی جاتیں اور آپس میں مل بانٹ کر استعمال کی جاتیں، آپس میں ملاقاتیں کی جاتیں، چائے اور قہوے تیار کیے جا رہے ہوتے یا تیار کرنے کے لیے اصرار کیا جا رہا ہوتا...... غریب اور مفلس قیدی بھی پیٹ بھر کر کھاتے اور دل کھول کر سگریٹ پیتے۔

ناظم سے دوستی کے بعد یہ میری پہلی عید تھی۔ ہم عید سے ایک روز پہلے حجام کی دکان پر گئے، انہوں نے مجھ سے پہلے حجامت اور شیو بنوائی۔ اور جب میں ان کی خالی کی ہوئی کرسی پر بیٹھ رہا تھا، وہ کھڑے ہو کر بوڑھے حجام کے گندے آئینے میں دیکھ رہے تھے۔ یہ حجام تقریباً پندرہ سال سے مسلسل جیل میں کام کر رہا تھا۔ ناظم آمنے سامنے رکھے ہوئے آئینوں میں سے دیکھ رہے تھے کہ ان کے بال کیسے کٹے ہیں اور شیو کا معائنہ کر رہے تھے۔

حجام کے مددگار لڑکے نے، جو کہ صحت مند نظر آنے والا چودہ پندرہ سال کا دیہاتی لڑکا تھا، انہیں ایک طشتری پیش کی۔ لڑکے نے "Koylu" کی سگریٹ کی ڈبیہ سے سگریٹ نکال کر کافی کی ایک پرچ میں رکھے اور ایک دوسری پرچ میں عید کی رنگین مٹھائیاں تھیں۔ طشتری میں ایک ''یوڈی کلون'' کی بوتل بھی تھی۔

دستور کے مطابق ناظم نے طشتری سے ایک سگریٹ اٹھالیا۔ لڑکے کے اصرار پر انہوں نے مٹھائی کا ایک ٹکڑا بھی اٹھالیا اور تھوڑا سا 'یوڈی کلون' ہاتھ پر لگالیا۔

طشتری میں ٹپ کے طور پر تھوڑی سی رقم رکھنا بھی رسم کا حصہ تھا...... اور یقیناً ناظم یہ جانتے تھے۔ انہوں نے جھجکتے ہوئے سرخ دھاریوں والے پاجامے کی جیبوں کو ٹٹولا اور پھر مسکرائے: ''کمال ہے! یار۔''

ہم نے آئینے میں سے ایک دوسرے کو دیکھا..........

''کوئی بات نہیں، کوئی بات نہیں۔''

میں نے محسوس کیا کہ ناظم نے ٹپ دینا چاہی جیسا کہ موقع کا تقاضا تھا اور اس کے لیے اپنی جیبوں میں ہاتھ ڈالا تھا۔ اور وہ میری جانب ان نگاہوں سے دیکھ رہے تھے کہ وہ یہ خوشی حاصل نہیں کر سکے...... یا شاید یہ میرا تصور ہو؟

V

جنوبی ہوا کے تیز جھکڑ چل رہے تھے..... تیز و تند گرم اور چیختی ہوئی ہوا۔ نصف شب کا وقت تھا، دروازے دھڑا دھڑ بج رہے تھے، دُور کہیں کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹنے اور درختوں کی شاخوں سے الجھتی ہوئی ہوا کی شائیں شائیں کی سی آوازیں آ رہی تھیں۔

آدھی رات سے زیادہ کا وقت بیت چکا تھا۔ جاپانی کلاک جو ناظم نے کسی وقت بیولو سے خریدا تھا، رات کے دو بجا رہا تھا۔ میں اس وقت، مجھے یاد نہیں، خدا جانے کیا پڑھ رہا تھا اور وہ سو رہے تھے۔ پھر وہ اچانک اچھل کر اپنے بستر پر بیٹھ گئے اور کاٹن کی چادر ایک طرف پھینک دی۔ ان کی نیلی آنکھیں نیند سے بھری ہوئی تھیں۔

''کیا تم مجھے اپنی پنسل دو گے؟''

میں نے انہیں پنسل دے دی اور میں غور سے دیکھ رہا تھا کہ وہ کیا کرنے والے ہیں۔ انہوں نے اپنے بستر کی سرہانے کی دیوار پر کچھ لکھا، پنسل واپس کی اور بڑی متانت کے ساتھ دوبارہ لیٹ گئے اور چادر کو کھینچ کر سر پر اوڑھ لیا۔

میں بڑی احتیاط کے ساتھ اٹھا اور انہوں نے جو لکھا تھا، اسے پڑھا۔

''سونی اور تنہا لہروں پر

ایک خالی ٹین کا ڈبہ''

دوسرے روز مجھے ان کی کھڑاؤں کی کھٹ کھٹ سنائی دی۔ وہ جیل کی راہداری میں

کنکریٹ کے فرش پر آگے پیچھے تیزی سے چکر لگا رہے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ اب پھر وہ شاعری پر غور کر رہے ہیں...... میں جا کر کوٹھڑی کے دروازے پر کھڑا ہو گیا، وہ کسی بھٹکی ہوئی روح کی مانند، بھنبھناہٹ کی آواز نکالتے ہوئے اپنی شہادت کی انگلی کو انگوٹھے کے ساتھ مسلتے ہوئے یوں چل رہے تھے جیسے ہجوم میں سے راستہ بناتے ہوئے جا رہے ہوں۔ وہ کئی مرتبہ دوسرے قیدیوں سے ٹکرائے جو اکیلے یا دو دو کی صورت آ جا رہے تھے، پھر اپنے آپ کو سنبھالا دیتے ہوئے ہاتھ کے اشارے سے معذرت اور معافی طلب کرتے اور پھر دوبارہ مجھے وہی بھنبھناہٹ کی آواز، راہداری میں آگے پیچھے جاتے ہوئے ان کے قدموں کی آواز سنائی دینے لگتی، وہ کبھی تو راہداری کے آخری سرے تک جاتے اور کبھی اچانک کہیں سے بھی پلٹ پڑتے۔ کبھی کبھار وہ راہداری میں کھلنے والی کسی ایک کوٹھڑی میں تیزی سے داخل ہوتے اور پھر اسی تیزی کے ساتھ باہر آ جاتے۔ پھر مجھے خیال آیا کہ وہ مجھے ڈھونڈ رہے ہیں لیکن میں تو کوٹھڑی کے دروازے پر کھڑا تھا، وہ مجھے اندر کہاں دیکھ سکتے تھے، جب وہ تیزی سے باہر نکل رہے تھے تو مجھ سے ٹکرا گئے۔ وہ کچھ دیر پریشانی کے عالم میں مجھے گھورتے رہے، گویا بھول گئے ہوں کہ مجھے کیا کہنا چاہتے تھے۔ انہوں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا، "برائے مہربانی ذرا اپنی پنسل دو۔" اور جب تک میں جیب سے پنسل نکالتا وہ دوبارہ چلتے ہوئے راہداری میں آگے نکل گئے۔ پھر وہ تیزی سے پلٹے اور جیسے ہی میرے پاس سے گزرے میں نے اپنی پنسل آگے کر دی۔ لیکن شاید وہ یہ بات بھول چکے تھے اور انہوں نے چلنا جاری رکھا۔ اچانک وہ ایک لمحے کے لیے کچھ الجھے سے دکھائی دیئے، پھر انہوں نے پنسل لے لی اور شکریہ ادا کرنے کے لیے بڑی متانت سے تھوڑا سا جھکے اور کھٹ کھٹ کرتے ہوئے اپنی کھڑاؤں میں آگے نکل گئے۔

"سب سے زیادہ تکلیف دہ بات..." وہ کہا کرتے تھے، "لوگوں کا اس وقت مجھے گھور گھور کر دیکھنا ہوتا ہے جب میں اپنے خیالات میں غرق اِدھر اُدھر چل پھر رہا ہوتا ہوں۔ مجھے یہ خوف ہوتا ہے کہ وہ مجھے شاید پاگل سمجھ رہے ہوں گے اور میں پوری طرح سے سوچ بچار نہیں کر پاتا۔"

ایک دن کسی جگہ جہاں وہ مہمان تھے، میرا خیال ہے کہ اپنے کسی رشتہ دار کے گھر پر

تھے، ان کا کچھ لکھنے کا موڈ بن گیا۔ وہ اونچی آواز میں پڑھتے ہوئے کوٹھڑی میں ایک سے دوسرے کونے کی طرف چلنا شروع ہو گئے اور لحہ بہ لحہ زیادہ سے زیادہ جوش میں آتے چلے گئے۔ ایک نوجوان ملازمہ نے انہیں اس حالت میں دیکھا تو بھاگتی ہوئی گھر کی مالکہ کے پاس گئی اور کہنے لگی: ''دیکھیں مادام، میرا خیال ہے کہ آپ کے مہمان ہوش وحواس کھو چکے ہیں!''

میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ناظم جب چاہتے تھے اپنی مرضی سے پورے شوق اور جوش وجذبے کے ساتھ لکھنا شروع کر سکتے تھے۔ وہ اپنا دن ٹکڑوں میں بانٹ لیا کرتے تھے۔ انہوں نے مقرر کر رکھا تھا کہ ایک مخصوص وقت پر لکھنے بیٹھیں گے اور ایک مخصوص وقت تک لکھتے رہیں گے۔ ایسی صورت میں وہ کسی ریڈیو کی طرح اپنے شوق اور جوش وجذبے کو بٹن گھما کر آن کر لیتے اور اپنا کام شروع کر دیتے۔

ناظم اپنے قافیوں کا انتخاب بھی مخصوص مقاصد کی خاطر کرتے تھے۔ وہ قافیے محض شاعری کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے نہیں ہوتے تھے۔

کسی بھی چیز کو جس کا تعلق لکھنے لکھانے یا کسی فنی سرگرمی سے ہوتا تھا، وہ بڑی سنجیدگی سے لیتے تھے اور سمجھتے تھے کہ ادیب یا فنکار پر بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ ادیب یا فنکار ہمیشہ محنت کش عوام کے سامنے جواب دہ ہوتا ہے۔ وہ اس نظریے کے پوری طرح سے مخالف تھے جسے عام طور پر اس فقرے میں بیان کیا جاتا ہے: ''شاعروں کے فریب میں مت آؤ، وہ جو کچھ کہہ رہے ہوتے ہیں مکمل جھوٹ ہوتا ہے۔'' ناظم کے نزدیک یہ جملہ یوں تھا: ''یقین رکھو، شاعر کا کہا ہوا ایک ایک لفظ قطعی طور پر سچ ہوتا ہے۔''

ناظم کا عقیدہ تھا کہ ایک شاعر ''......روح کا انجینئر ہوتا ہے۔''

وہ محنتی لوگوں کی بہت زیادہ عزت کرتے تھے۔ جیل میں لوگ قتل کر دیتے ہیں، قتل ہو جاتے ہیں، آپ کو ایسے لوگ ملتے ہیں جو آپ کی ماں، بہن اور بیوی وغیرہ پر فحش فقرے کستے ہیں، جو کفر بکتے ہیں۔ ناظم قیدیوں کی ورکشاپس میں میں چلے جایا کرتے تھے، جہاں قیدی نشہ کرنے، جوا کھیلنے یا لوگوں پر خنجر زنی کرنے کی بجائے اپنا وقت مفید کام کرتے ہوئے بسر کرتے تھے۔ اگر انہیں موقع مل جاتا تو وہ وہاں کوئی نہ کوئی کام کرتے، وہ کسی لکڑی کے ٹکڑے کو رندہ

لگاتے، کپڑا بنتے..... بعض لوگ ایسے کاموں کو کسی خفیہ ایجنڈے پر محمول دیتے ہیں، لیکن جہاں تک میں نے دیکھا یا سمجھا، یہ محض اُس تکریم اور عزت کے اظہار کی مثال کے سوا کچھ نہیں تھا جو وہ اپنے ساتھیوں کے لیے اپنے دل میں رکھتے تھے، اور اس اہمیت کا اظہار تھا جو وہ ان لوگوں کو دیتے تھے جو کچھ نہ کچھ تخلیق کرتے ہیں، جو پیداواری عمل میں حقیقی طور پر حصہ ڈالتے ہیں۔ میں یہ بات بھی کہنا چاہوں گا کہ اس کے برعکس جو عام طور پر خیال کیا جاتا ہے، ناظم ہرگز کرخت مزاج انسان نہیں تھے جو ہر موقع پر بحث وتکرار کرتا ہو یا کسی پروپیگنڈا میں مصروف رہتا ہو۔ وہ ہمیشہ ہر شخص کی رائے کو بہت زیادہ اہمیت دیتے تھے اور بحث مباحثے میں نہیں الجھتے تھے جب تک کہ ان کو مجبور نہ کر دیا جائے اور بعض اوقات تو مجبور کیے جانے پر بھی خاموش ہی رہتے۔

ناظم اپنے نظریات پر یقین رکھتے تھے۔ وہ ان لوگوں کی عزت وتکریم کرتے تھے جو کسی مقصد پر یقین رکھتے ہوں، خواہ یہ مقصد کچھ بھی ہو۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ممت عاکف کی عزت کرتے تھے۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ ان کے خیال میں ممت عاکف کے نظریات درست تھے بلکہ وہ عاکف کی اس لیے قدر کرتے تھے کہ وہ ایک صاحب کردار انسان تھے جو اپنے مقصد پر یقین رکھتے تھے۔

کچھ لوگ ہوتے ہیں جو مخصوص نظریات کے حامی ہوتے ہیں، وہ چند مخصوص نظریات اور اصولوں کی پیروی کرنے کے دعوے دار ہوتے ہیں، لیکن عملی طور پر وہ اپنے نظریات اور اصولوں پر بہ مشکل ہی عمل پیرا ہو پاتے ہیں۔ ناظم جو کہتے وہی کرنے کی کوشش کرتے، ان کے اعمال اور نظریات میں یکسانیت تھی۔

وہ انسانوں سے بے پناہ محبت رکھتے تھے، یہاں تک کہ انھوں نے اسے ایک ''مذہب'' کا درجہ دے دیا تھا۔ خاص طور پر بچے...... میں نے اپنی آنکھوں سے کوئی ایسا واقعہ نہیں دیکھا تھا کہ انھوں نے کسی روتے ہوئے بچے کو گود میں اٹھایا ہو اور وہ فوراً چپ کر گیا ہو، لیکن میں حتمی طور پر کہہ سکتا ہوں کہ کوئی بھی بچہ ان کے ساتھ دوستی ضرور کر سکتا تھا۔

ایک دن میں نے ان کے اس کردار کو ذہن میں رکھتے ہوئے ایک نظم لکھی اور پھر انھیں دکھائی۔

میں نے کہا، ''استاد! میں نے یہ سب کچھ آپ سے منسوب کیا ہے!''

انہوں نے اسے ہاتھ میں لیا اور پڑھنے لگے۔ ان کے نتھنے پھڑ پھڑا رہے تھے جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ہنسی کو قابو کرنے کی شدید کوشش کر رہے تھے:

چالیس سال کی عمر میں بھاگتے ہوئے پہیہ دوڑانا،

پانی میں صابن گھول کر بلبلے اڑانا،

نعمت خانے سے جیم چُرانا،

ہمسائے کی بیٹی کو جھریوں میں سے تاکنا!

چاندی کے چمکتے ہوئے چمچے سے گلاب جیسا سرخ جام اُڑانا

یہ ہے بچپنا۔

چالیس سال کی عمر میں بھاگتے ہوئے پہیہ دوڑانا

پانی میں صابن گھول کر بلبلے اُڑانا

دنیا سے اور لوگوں سے پیار جتانا

ہر بات کے باوجود پیار کرنے کے قابل ہونا

پیار کرنا، پیار کرنا......

پانی میں صابن گھول کر بلبلے اڑانا!

''نظم کے طور پر یہ بہت اچھی ہے۔'' انہوں نے کہا، ''لیکن کیا میں حقیقتاً ایسا ہی انوکھا ہوں؟''

''میں تو محض آپ کے مزاج کی عکاسی کرنے کی کوشش کر رہا تھا......''

''ٹھیک ہے، لیکن ذرا تصور کرو ایک چالیس سال کا بالغ آدمی نیکر پہنے گلیوں میں پہیے کے پیچھے دوڑ رہا ہو! ایک بظاہر سنجیدہ آدمی سودائیوں کی طرح پتھر کے فرش پر بیٹھا ہو، ٹانگوں کے درمیان ایک پانی کا پیالہ رکھا ہو، ہاتھ میں صابن کی ٹکیا پکڑی ہو اور وہ بلبلے بنا کر ہوا میں اڑا رہا ہو......؟''

''نہیں، نہیں، میرے کہنے کا مطلب ہرگز یہ نہیں تھا۔'' میں نے کہا، ''مثال کے طور پر

تصور کریں، نسلِ انسانی فطرت کے خلاف نبرد آزمائی سے مکمل آزاد ہو چکی ہو، اور وہ تمام طفیلیوں سے نجات پا چکی ہو، اور دنیا جنت میں تبدیل ہو چکی ہو......''

انہوں نے کوئی جواب نہ دیا، لیکن ان کی خاموشی ایسی تھی کہ اس نے مجھے دوبارہ سوچنے پر مجبور کر دیا...... ٹھیک ہے، ''جنت کے دنوں'' میں چالیس سال کے آدمیوں کے پاس یقیناً بہت سا وقت ہوگا جو وہ اپنی مرضی سے گزار سکیں، لیکن ان کے ذہن، اتنے اُکھڑے ہوئے تو نہیں ہوں گے کہ وہ پہیوں کو گھماتے ہوئے گلیوں میں بھاگتے پھریں، نہ ہی وہ اتنے پاگل ہوں گے کہ بلبلے بنا کر ہوا میں اڑاتے پھریں......

ابھی تک میرے ذہن میں جو آتا، میں ناظم سے بلا جھجک پوچھ لیا کرتا تھا۔ میرے پاس اُن سے پوچھنے کے لیے کچھ قدرے سنجیدہ، فلسفیانہ نظر آنے والے سوالات بھی تھے، لیکن کچھ دوسرے غیر سنجیدہ ہلکے پھلکے انتہائی فرسودہ سوالات بھی ہوتے تھے، ایسی باتیں جو آپ کسی تیسرے درجے کے میوزک ہال سے منسوب کرتے ہوں۔

باب علی یا انقرہ جدیسی (باب علی عثمانی حکومت کا ہیڈ کوارٹر اور اخبارات اور کتابوں کی اشاعت کا مرکز بھی تھا جب کہ انقرہ جدیسی ایک چوڑی ڈھلوانی سڑک ہے جو ''سرکیجی'' (Serkeci) ریلوے سٹیشن کو باب علی کے علاقے سے ملاتی ہے) کے بارے میں چھوٹی موٹی تمام تفصیلات کا علم مجھے ناظم سے ہی ہوا تھا۔ مجھے یاد تھا کہ میں وہاں چند مرتبہ اپنے والد کے ساتھ گیا تھا اور میں نے محسوس کیا تھا کہ اگر ایک دن قسمت مجھے اس مشہور شارعِ عام پر لے گئی تو مجھے ہرگز حیرت نہیں ہوگی۔

جب میں چھوٹا تھا تو بغیر پوری طرح جانے کہ میں ایسا کیوں کرتا تھا، میں نے باقاعدگی سے مختلف اخبارات خریدنا اور ان کو جمع کرنا شروع کر دیا تھا۔ میں کچھ مزید بڑا ہوا تو میری مطالعے کی عادت مزید شدت اختیار کر گئی، اور میری سمت بدل گئی اور میں نے کھیلوں کے میگزین جمع کرنے شروع کر دیے، بعد میں پھر ادبی میگزینوں نے ان کی جگہ لے لی۔

جیل میں بھی کچھ ایسا ہی تھا...... میں پیسے دیتا اور وارڈرز یا قیدیوں سے جو لیبر لاء کے تحت باہر کام کرنے کے لیے جاتے تھے، ادبی میگزین منگوایا کرتا تھا۔ ان میگزینوں میں سے کئی

ایک ایسی نظموں کے مجموعے شائع کرتے تھے جو نئے ادبی رجحانات کی عکاسی کرتی تھیں، جو بحروں، قافیوں اور ہم آہنگی سے محروم ہوتی تھیں۔ شاعری سیکھنے کے لیے کاغذوں کے پلندے بھرنے کے بعد میں ایسی چیزوں کو جو محض بھرتی کی نظر آتی ہوں زیادہ اہمیت نہیں دیتا تھا، ایسی چیزیں جو بہت زیادہ مغز ماری کا نتیجہ نظر نہیں آتی تھیں۔ عزت اور میں ان کو ہمیشہ ہدفِ ملامت بناتے تھے...... ہم ان کا مذاق اڑاتے، لیکن ہم یہ بھی سمجھتے تھے کہ اس میں سے کچھ نہ کچھ ضرور جنم لے گا۔

مجھے یہ بات ہمیشہ یاد رہے گی: عزت اور میں سمجھتے تھے ہم ان جیسی بہت سی ''نظمیں'' لکھ چکے ہیں۔ یہ وہ بات تھی جو ہم سمجھتے تھے، لیکن ناظم سے ملنے کے بعد مجھے سمجھ آئی کہ ان نظموں، جو کہ ''نئی شاعری'' کی شعوری تشکیل ہے، اور ہماری نظموں کے درمیان جو محض نقالی تھیں اور ان کی زبان اور ہمارے اکھڑ، بے رس اور درشت بیان میں بہت فرق تھا۔

میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہیت و انداز کے حوالے سے اختصار اور ناپختگی سے قطع نظر نئی شاعری، اس کی زبان اور برجستہ خصوصیت سے لطف اندوز ہونے کے لیے آپ کو قدیم، فرسودہ اور پُرتصنع نظریہ سازی سے ناتا توڑنا ہوگا۔

وہ لوگ جو ''ادبیات عثمانیہ'' اور ''تعلیم ادبیات'' کے اثر سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتے اور وہ لوگ جو ادبی روایات سے جو کم و بیش ایک ہی راستے کی پیروی کرتی ہیں اور دوسروں کو بھی اس پر چلنے کی تلقین کرتی ہیں، کنارہ کشی اختیار نہیں کر سکتے، وہ نئی قسم کی تحریروں کو نہیں سمجھ سکتے اور ہمیں انہیں یہ رعایت دینی چاہیے۔

ناظم زبان کو سادہ بنانے کے عمل کو کھلے دل سے قبول کرتے تھے، تاہم وہ خود انتہائی اقدام اٹھانے سے گریز کرتے تھے۔

''............زبان کے معاملے میں ہمیں اپنے آپ کو عوام سے ہم آہنگ رکھنا چاہیے۔ ہمیں ایسے الفاظ استعمال نہیں کرنے چاہئیں جو لوگ اپنی روزمرہ کی بول چال میں استعمال نہیں کرتے اور جن کو وہ آسانی سے سمجھ نہیں سکتے۔'' وہ کہا کرتے تھے۔ مثال کے طور پر نئے الفاظ میں وہ جس لفظ کو سب سے زیادہ پسند کرتے تھے وہ "olağanüstü" (غیر معمولی) تھا۔ وہ اس لفظ کو

بہت زیادہ استعمال کرتے تھے۔ وہ ایسے الفاظ پسند کرتے تھے جو اصل ترکی الفاظ کا مجموعہ تھے اور وہ الفاظ جو لوگ کسی بھی طور پر پہلے سے بے تکلفانہ بات چیت میں استعمال کرتے تھے۔ وہ اُن عربی یا فارسی الفاظ کو جو لوگوں نے اپنے استعمال کے لیے اپنار کھے تھے اور انہیں اپنی زبان کے قالب میں ڈھال لیا تھا، ترک کرنے کے خلاف تھے اور اس بات کو تسلیم نہیں کرتے تھے کہ ان کو فرانسیسی یا چغتائی یا کسی بھی دوسری زبان سے تبدیل کر دینا چاہیے۔ اور اس بات میں مجھے کوئی شک نہیں کہ وہ پختہ یقین رکھتے تھے کہ ترک زبان اوپر سے لاگو کیے جانے والے احکامات کے نتیجے میں ترقی نہیں کر سکتی بلکہ ادیبوں اور ادب کے ذریعے پروان چڑھ سکتی ہے۔ اس کے باوجود وہ یہ تسلیم کرنے کے لیے تیار تھے کہ بہت سے الفاظ جن کو حکام نے اوپر سے نافذ کرنے کی کوشش کی بہت مقبولیت حاصل کر گئے ہیں۔ اگرچہ ایک بڑی تعداد میں الفاظ کو رَد بھی کر دیا گیا تھا، لیکن سب باتوں کو دیکھتے ہوئے وہ سمجھتے تھے کہ اوپر سے متعارف کروائے گئے الفاظ اپنا استعمال رکھتے تھے۔

وہ شاعری میں جنم لینے والے نئے رجحانات میں بہت دلچسپی رکھتے تھے۔ اگرچہ وہ نئے شاعروں کے ساتھ ہمدردانہ رویہ رکھتے تھے، وہ کہا کرتے تھے، پھر بھی وہ جو کچھ کر رہے ہیں یا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، کسی نئے پن کا حامل نہیں ہے۔

وہ تسلیم کرتے تھے کہ شاعری بحر، قافیے اور ہم آہنگی اور حتیٰ کہ مطالب کو بھی ایک طرف کرتے ہوئے لکھی جا سکتی ہے بلکہ وہ اس سے بھی آگے جاتے اور تسلیم کرتے تھے کہ شاعری لکھے بغیر محض سوچ کے عمل سے بھی مرتب کی جا سکتی ہے۔ ''لیکن.... '' وہ کہا کرتے تھے، ''ہمیں اس قسم کی اساسی تخفیف کی کیوں ضرورت ہے؟ ہمیں ان مواقع کو کیوں استعمال نہیں کرنا چاہیے جن سے شاعری اپنے پروان چڑھنے کے صد ہا برسوں کے دوران مستفید ہوتی رہی ہے؟ یہ محض اس بات کو فرض کر لینے کا نتیجہ ہے کہ نئی چیزیں فارم کو تبدیل کر کے پیدا کی جا سکتی ہیں جب کہ اصل معاملہ فارم کی نسبت مندرجات کا ہے یعنی کہ نظم کے نفسِ مضمون میں تبدیلیاں پیدا کی جائیں۔ نئی طرح ڈالنے والے ایک ایسے گروہ کی نمائندگی کرتے ہیں جو اپنی امیدیں اور مقاصد کھو چکا ہے، جو تنزلی کا شکار ہو چکا ہے یا تنزلی کی جانب گامزن ہے۔ وہ دنیا سے گریز کی خواہش کی نمائندگی

کرتے ہیں اور اس کی جڑیں حقیقت کے سامنے شکست خوردگی اور موت میں وابستہ ہیں، خاص طور پر یہ موت کی نمائندگی کرتے ہیں..... وہ اپنے آپ کو انسانیت کے عظیم مقاصد میں شامل نہیں کر پاتے یا ایسا کرنے کے لیے ان میں جرأت کا فقدان ہوتا ہے۔ ان کے بارے میں واحد مثبت چیز اُن کی زبان ہے۔ وہ زبان کا بہت عمدہ استعمال کرتے ہیں۔ اگر چہ یہ ایک محدود انداز میں ہوتا ہے۔ ان کی نظمیں ایسے ٹکڑے ہوتی ہیں جو ایک بہت بڑے فن پارے سے پھوٹی ہوتی ہیں۔

ناظم ہمیشہ نظم اور نثر کے درمیان حد بندی کے بارے میں بہت محتاط ہوتے تھے۔ ان کے ایک شاہکار "Ülkem İnsan Manzaraları" میں آپ دیکھیں گے کہ وہ شاعری کو نثر کے اتنے قریب لے آتے ہیں جتنا ممکن ہے، اور یہ کہ انہوں نے ان تمام امکانات کا استعمال کیا ہے جو کہ شاعری اب تک حاصل کر چکی ہے۔

VI

بہار کے آغاز میں عزت کی مدت قید پوری ہو چکی تھی، اسے رہا کر دیا گیا تھا اور اس کے بعد نجاتی کی باری تھی...... مجھے بھی ایک سال اور قید کاٹنا تھی۔ تمام اختلافات کے باوجود جو ہم میں پائے جاتے تھے عزت کے جانے پر میں رنجیدہ ہو گیا تھا۔ نجاتی لیبرلاء سے فائدہ اٹھا رہا تھا۔ وہ سارا دن شام تک دوسرے قیدیوں کے ساتھ جو مزدوری کرتے تھے، باہر رہتا تھا......

اور ہم فٹ بال یا کوئی اور گیم بھی نہیں کھیل رہے تھے۔

جیل کی گراؤنڈز فٹ بال کے لیے بہت موزوں تھیں اور ہمیں پتا چلا تھا کہ ہم سے پہلے قیدیوں کا فٹ بال کھیلنا ایک معمول کی بات تھی۔ لیکن گاہے بہ گاہے چیف وارڈر ہمیں کھیلنے سے روکنے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔ اس کا منطق یہ تھا کہ فٹ بال کو کک مار کر جیل کی دیوار سے باہر پھینکنے اور پھر باہر سے دوبارہ جیل میں پھینکنے کے عمل کو منشیات کے کاروبار کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے، اگرچہ اس کے امکانات کم ہی کیوں نہ ہوں، اس نے یہ دلیل دیتے ہوئے ہم سے ہماری تفریح کا واحد ذریعہ چھین لیا تھا۔

ان سہ پہروں کو جب کبھی ہم چیف وارڈر کو فٹ بال کھیلنے کی اجازت دینے کے لیے قائل کر لیتے، ہم باغ میں دو ٹیموں کی صورت میں پہنچ جاتے اور دوسرے قیدی جیل کی کھڑکیوں کی سلاخوں کے پیچھے بڑے جوش و جذبے کے ساتھ ہجوم کی صورت جمع ہو جاتے اور اسی طرح چیختے چلاتے جس طرح حقیقی مقابلوں میں ہوتا ہے۔ ''بہت خوب''، ''کک لگاؤ!''، ''اسے روکو!''،

''سیدھی شاٹ مارو'' وغیرہ وغیرہ۔

ناظم کے آنے سے پہلے بھی ہم کھیلا کرتے تھے اور میدان میں ہم ایک دوسرے کے اتنے ہی قریب ہوا کرتے تھے جیسے کہ شاعری میں تھے۔ عزت اور نجاتی بہت اچھا کھیلتے تھے، خاص طور پر عزت...... اور مجھے تو فٹ بال کا نشہ تھا، اس کے لیے میں نے سکول بھی چھوڑ دیا تھا، شاید اس کی کچھ اور وجوہات بھی ہوں لیکن یہ ایک اہم وجہ تھی۔

چلیں چھوڑیں، مختصراً بات کرتے ہیں، ایک دن ایک چالیس سالہ نیلی آنکھوں والا شاعر بھی جس کا بال گھنگھرالے اور بھورے تھے، کھیل میں شامل ہو گیا۔ وہ ٹیم میں مشکل ترین پوزیشن سینٹر ہاف میں کھیل رہا تھا۔

میں اور عزت اکثر اس کی ٹیم کے خلاف کھیلا کرتے تھے۔ میں سینٹر فارورڈ کی پوزیشن میں کھیلتا تھا اور عزت ان سائیڈ رائٹ میں کھیلتا یا پھر وہ سینٹر فارورڈ میں اور میں ان سائیڈ رائٹ پر ہوتا۔ چوں کہ وہ فٹ بال میں اتنا اچھا نہیں تھا جتنا شاعری میں تیز تھا، اور نہ ہی اس کا سانس اتنا پختہ تھا۔ ہم آسانی سے اسے جُل دے کر نکل جاتے اور اس دفاع کو توڑ دیتے جس کے لیے اس پر انحصار کیا گیا ہوتا تھا۔ یہ بات اسے طیش دلا دیتی اور وہ بہت زیادہ بوکھلا جاتا، غصے میں اپنی بھوری ٹوپی کو گھما کر اس کا چھجا پیچھے کی جانب کر لیتا اور سینٹر فارورڈ میں چلا جاتا، ہاف اور بیک میں کھیلنے والوں کی سرزنش کرتا۔ میدان میں ٹیم کو نئی ترتیب دیتا۔ اتنا کچھ کرنے کے بعد جب کھیل دوبارہ شروع ہوتا تو زیادہ دیر نہیں گزرتی تھی کہ میں اور عزت فٹ بال ایک دوسرے کو پاس کرتے ہوئے ان کے گول پوسٹ پر حملہ آور ہوتے اور گول کر دیتے۔

وہ شدید غصے میں آ جاتا...... اس کا چہرہ سرخ ہو جاتا، اس کی نیلی روشن آنکھیں اور سنہری بھنویں اس کے غصے سے تمتماتے ہوئے چہرے میں مدغم ہو جاتیں۔ اگر ہم اس سے فٹ بال کو لے نکلتے اور اسے جُل دے جاتے تو وہ قواعد و ضوابط کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے ہمیں ٹھوکریں اور کہنیاں مارتا اور دھکے دینا شروع کر دیتا۔ ایک مرتبہ تو اس نے مجھے واقعی ہی بہت زوردار کک ماری، سچ تو یہ ہے کہ وہ ایک زبردست کک تھی۔

جب نجاتی بھی چلا گیا تو ہمیں فٹ بال چھوڑنا پڑ گیا۔ تاہم فٹ بال کا باہر والا چمڑے کا

کوراور اندر کا بلیڈر دونوں چیتھڑوں میں تبدیل ہو چکے تھے اور شدید سردی شروع ہو چکی تھی۔

میرے اسباق ایک باقاعدہ رفتار کے ساتھ جاری تھے۔لیکن جب کبھی میں اسباق کے بوجھ اور سنجیدگی سے اکتا جاتا تو مجھے یوں محسوس ہوتا کہ ان پتھر کی دیواروں کے اندر میں دھماکے سے پھٹ جاؤں گا۔ناظم کی حالت بھی کم و بیش ایسی ہی ہوتی۔ میں ان کی جانب دیکھتا۔وہ کتاب ہاتھ میں اٹھائے بستر پر دراز لیٹے ہوتے پھر وہ پڑھنا بند کر دیتے اور اس سے پہلے کہ وہ کتاب دُور پھینکتے ،ہم بغیر کوئی لفظ ادا کیے ایک دوسرے کو گھورتے ، ہمارے خیالات بالکل ایک جیسے ہوتے جنہوں نے ایک ہی قسم کی اکتاہٹ سے جنم لیا ہوتا تھا...... ہم آپس میں بہت زیادہ باتیں کیا کرتے تھے...... خاص طور پر جب باہر آسمان بادلوں سے ڈھکا سرمئی نظر آ رہا ہوتا اور شدید برف باری ہو رہی ہوتی، یا جب ان پتھر کی دیواروں کے اندر سرد روز و شب متواتر جاری رہتے، جب سردی کی شدت میں دگنا اضافہ ہو جاتا...... اپنے دائیں دیکھو، پتھر کی دیوار! بائیں دیکھو پتھر کی دیوار! سامنے دیکھو تو ایک کھڑکی ،جس میں سے باہر گرتی ہوئی برف نظر آ رہی ہوتی! اگر برف باری نہ ہو رہی ہوتی تو پھر وہی پہاڑ، وہی آسمان اور وہی چند ٹیلے اور بے نظر آ رہے ہوتے۔ صبح کا آغاز دھندلی سی اُداس فضا سے ہوتا اور پھر یہ اسی طرح کی دھندلی سی اُداس دوپہر میں تبدیل ہو جاتی اور پھر یہ شام میں داخل ہو جاتی اور وہی سرمئی سی اُداسی چھائی رہتی...... ایک دبی دبی گھبراہٹ میں مسلسل شور شرابے کی آوازوں نے جیل کی فضا کو گھیر رکھا ہوتا جو رات کے چھا جانے تک جاری رہتا، جب پہرے داروں کی سیٹیوں کی آوازیں سرد اور برہنہ دیواروں کے ساتھ ٹکرا کر گونجنے لگتیں اور جیل کی بھیانک راتوں کو دن سے جدا کر رہی ہوتیں، جب بیرکوں کے دروازوں کو باہر سے کنڈے چڑھا کر مقفل کر دیا جاتا......

کھڑکیاں گہری یاسیت کے اندھیروں میں تبدیل ہو جاتیں،عورتوں سے محروم مرد اپنی تمناؤں سے بھری آنکھوں کو سختی سے بھینچتے ہوئے نیند کی وادیوں میں اتر جانے کی کوشش کر رہے ہوتے، راتیں جو بے حد دراز ہوتیں۔

راتیں تو خیر تھیں ہی، دن بھی ایسے ہی تھے...... میں ایسے دنوں سے اچھی طرح واقف تھا۔ایسے دنوں میں، نہ صرف جیل میں بلکہ باہر کی آزاد فضا میں بھی اداسی اور مایوسی مجھ پر غلبہ

جمائے رکھتی اور ایک سوفی صد منفی چارج والی فضا مجھے اپنی لپیٹ میں لیے ہوتی۔

ان لمحوں میں جب ہماری نگاہیں آپس میں ٹکرائیں اور ہم خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے، ناظم نے ایک گہرا سانس لیا اور زیر لب بڑبڑائے:

''یا خدایا......! میرے تو ابھی بیس سال مزید ہیں۔''

پھر اچانک انہوں نے جھرجھری لی اور اٹھ کر بیٹھ گئے۔ اپنے پائپ کے لیے اِدھر اُدھر ہاتھ مارے اور آخر کار اسے ڈھونڈ لیا۔ انہوں نے اس میں تھوڑا تمبا کو بھرا، وہ ابھی تک سخت مایوسی کے عالم میں تھے، پھر اُسے جلایا اور اوپر تلے گہرے گہرے کش لینے لگے۔ آخر میں انہوں نے اپنی آنکھوں میں مایوسی لیے میری جانب دیکھا:

''چھوڑو! اس کا کچھ نہیں ہو سکتا......'' انہوں نے کہا، ''اس طرح ہی رہنا ہوگا۔ میرا مطلب ہے اپنی فرانسیسی کی کتاب نکالو۔''

میری طرح اُن کا مسئلہ صرف بوجھل اور اُداس دن ہی نہیں تھے۔ میرے والد موجود تھے جو میری بیوی اور بچے کی دیکھ بھال کر رہے تھے اور صرف بیوی بچے کی ہی دیکھ بھال نہیں بلکہ مجھے بھی خرچ بھجواتے تھے۔ اور ناظم......؟ انہیں اپنی ماں اور بہن سے جو مدد ملتی تھی وہ بہ مشکل ان کی اپنی ضروریات کو پورا کر رہی تھی...... اور ان کی ایک بیوی بھی تھی جسے کہیں سے بھی کوئی مدد حاصل نہ تھی اور پھر ان کا دوست کمال طاہر بھی تھا......

اپنے ایک خط میں جو حال ہی میں موصول ہوا تھا، ان کی ہوشیار، جذباتی، بہت زیادہ حساس اور کفایت شعار بیوی پیرائے خانم نے لکھا تھا کہ وہ ان سردیوں میں جلانے کے لیے لکڑیاں نہ خرید سکنے پر پریشان ہیں۔ انہیں خدشہ تھا کہ اس کی بیٹی کو تپ دق تھی اور وہ اس کا مناسب اور موزوں علاج کروانے کے قابل نہ تھیں۔

میں جانتا تھا کہ پیرائے خانم کس قدر خیال رکھنے والی خاتون تھیں اور میں خود ناظم کی زبانی ان کے ذاتی ایثار کی بہت سی مثالیں سن چکا تھا۔ لہٰذا میں سمجھ سکتا تھا کہ اگر وہ اپنے قیدی خاوند کو اس قسم کی مایوسی کی باتیں لکھنے پر مجبور ہوئی ہیں تو وہ حقیقت میں بہت زیادہ ضرورت مند ہوں گی۔

اس کے بعد کئی روز تک ناظم نڈھال نڈھال، اپنے خیالوں میں گم اور پژمردہ حالت میں گھومتے پھرتے رہے۔ ایک موقع پر وہ کہنے لگے، "......اس جیل میں، اس جیل میں، اس سیکشن دو کی راہداریوں میں، میں سگریٹوں کے ٹوٹے چنتا رہا تھا اور اڑتالیس گھنٹوں تک میرے پاس سوائے سوکھی روٹی کے کھانے کو کچھ نہ تھا، لیکن اس وقت بھی میں نے اتنی مایوسی محسوس نہیں کی تھی جتنی اب کر رہا ہوں۔"

ایک دن ارطغرل جو کہ ہماری ہی وارڈ میں تھا، ایک تجویز لے کر آیا۔ وہ جیب تراشی کے الزام میں آیا تھا اور اسے آٹھ سال دو ماہ کی قید ہوئی تھی۔ اگرچہ کل رقم جو اس نے چرائی تھی، دو سو لیروں سے زیادہ نہ تھی۔ "میری بات سنو، استاد۔" اس نے کہا، "مجھے ایک منصوبہ سوجھا ہے، لیکن پتا نہیں تم اس بارے میں کیا سوچو گے۔"

منصوبہ قابل عمل تھا۔ ہم دو کھڈیاں خرید کر کپڑا بننے کی ورکشاپ قائم کر سکتے تھے اور ایک قیدی کے پاس جو چند روز میں رہائی پانے والا تھا کھڈیاں تھیں، جو وہ فروخت کرنا چاہتا تھا۔ یہ بالکل درست وقت تھا..... ناظم نے اس کے بارے میں غور کیا اور بہت سی جمع تفریق کیں..... وہ اپنا پائپ منہ میں دبائے کچھ دیر راہداری میں آگے پیچھے ٹہلتے رہے۔ انہوں نے منصوبے کو قابل عمل پایا، کیوں کہ اگلے چند روز میں انہوں نے گورنر، رجسٹرار اور پبلک پراسیکیوٹر سے رابطے کیے۔ وہ ضروری اجازت نامے حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے اور کام کی تیاری شروع کر دی گئی۔ چند روز کے دوران، ان کے علاوہ ایک مزید کھڈی خرید لی گئی اور وہ جیل میں پہنچ گئیں۔ تین کھڈیوں کو کام کے لیے تیار کر دیا گیا۔ اصل پریشانی دھاگے کا حصول تھا۔ دھاگا راشن پر ملتا تھا، اور جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے ایک کھڈی کے لیے صرف دو پیک دیے جاتے تھے اور یہ بھی صرف ان کھڈیوں کو جو کوآپریٹو کے پاس ایک مخصوص تاریخ کو رجسٹرڈ کروائی گئی تھیں۔ اس تاریخ کے بعد لگائی گئی کھڈیوں کو یہ رعایت حاصل نہیں تھی۔

دھاگا خرید لیا گیا، اور ناظم کی موجودگی میں جو اطمینان کے ساتھ پائپ کے گہرے گہرے کش لگا کر دھوئیں کے مرغولے چھوڑ رہے تھے اور ان کے نتھنے کامیابی کی خوشی سے پھڑ پھڑا رہے تھے، کھڈیاں چلنا شروع ہو گئیں۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ ناظم اپنے جوش اور خوشی کو بہ مشکل

سنبھالے ہوئے تھے۔ وہ تیزی سے دائیں سے بائیں، ایک کھڈی سے دوسری تک، شٹل کو گولی کی رفتار سے آتے جاتے دیکھتے ہوئے بھاگے پھر رہے تھے۔ کھڈیاں چلانے والے اپنے ہاتھوں اور پیروں دونوں سے کام لے رہے تھے۔ وہ بلیچنگ اور کلف لگنے کے عمل پر بھی نگاہ رکھے ہوئے تھے۔ بعض اوقات وہ گھبرائے ہوئے نظر آتے، بعض اوقات چیزوں کی وضاحت کر رہے ہوتے اور زیادہ تر "پیداوار" کے بارے میں باتیں کر رہے ہوتے۔

اگرچہ میں کھڈیوں کے کاروبار میں پہلے روز سے ہی شامل نہ تھا، منصوبہ بندی کے مرحلے میں اور نہ ہی سرمائے کے حصول میں، اس کے باوجود ناظم نے میرے لیے بھی ایک حصہ الگ کر رکھا تھا۔ ایک حصہ میرے لیے، ایک یا دو حصے کمال طاہر کے لیے، ایک حصہ ارطغرل، دو حصے پیرائے بھابی کے لیے اور ایک حصہ اپنے لیے۔

چادریں، تولیے اور مختلف قسم کا کپڑا جو بنا گیا تھا، وہ "دیونگ کو آپریٹو" کو بھیج دیا گیا تھا۔ ہمیں صرف بنائی کا معاوضہ ادا کیا جاتا تھا۔ جب ہمارا کپڑا کو آپریٹو کے پاس پہنچ گیا اور پیسے آ گئے، اس روز سے ناظم ایک سنجیدہ اکاؤنٹنٹ بن گئے۔ وہ اپنی عینک لگا کر میز پر بیٹھ گئے۔ ان کے ہاتھ میں پین تھا اور سامنے نوٹ بک رکھی تھی۔ انہوں نے جمع تفریق کا ایک سلسلہ شروع کر دیا، بہت زیادہ احتیاط اور باریک بینی سے انہوں نے ہر ایک کا حصہ آخری پینی تک نکالا اور اپنی پہلی فرصت میں پیرائے بھابی اور کمال طاہر کے حصے جتنی جلدی ممکن ہو سکتا تھا ڈاک کے ذریعے بھجوا دیے۔

اب لوگ انہیں "باس" کہہ کر بلانے لگے تھے۔

"......استاد، تم نے کام بڑھا لیا ہے، کیسا لگ رہا ہے؟ اچھا تو اب تمہیں پتا چل گیا...... کہ پیسے کیا کچھ کر سکتے ہیں۔"

ایسی ہی کئی باتیں.......

اور وہ ان سب باتوں کو بڑے اچھے مزاح اور ہنسی میں اڑا دیتے۔

"بالکل، بالکل!" وہ جواب میں کہتے، "میں بگ باس بن چکا ہوں، اور اب میرا کردار بھی کرپٹ ہو گیا ہے۔"

"آپ سے ایسی کوئی امید باقی نہیں رہ گئی۔" میں نے ان سے چھیڑ خانی کرتے ہوئے کہا۔

"یہ بھی درست ہے۔" ان کا جواب تھا، "بدقسمتی سے یہی کچھ ہو چکا ہے۔ اب مجھ سے کوئی امید نہیں رکھی جا سکتی۔ اب میں کسی کام کے قابل نہیں رہ گیا۔"

ناظم اپنے ساتھ کام کرنے والے لوگوں کی تمام ضروریات اور مسائل کا خیال رکھتے تھے۔ وہ مغربی اناطولیہ کے ان کھڈیوں پر کپڑا بننے والے جوانوں کے بہت گرویدہ ہو چکے تھے۔ اس بات نے ان لوگوں کو جنہوں نے اپنی کھڈیاں لگا رکھی تھیں، ان سے بدظن کر دیا تھا۔ ناظم بے التفاتی نہیں برت سکتے تھے۔ ناظم ان باتوں سے بے پرواہ اپنا کام کرتے رہے، کپڑا میٹروں کے میٹر بنتا چلا جا رہا تھا۔

ہم نے اڑتی اڑتی سی خبر سنی کہ کسی گاؤں کا ایک زمیندار ناظم کے خلاف منصوبہ بندی کر رہا ہے اور انہیں چاقو مروانا چاہتا ہے۔

دلچسپ بات یہ ہوئی کہ خانہ بدوش یا جو بھی وہ تھا، جسے رقم کا لالچ دے کر یہ کام کرنے کو کہا گیا تھا، ناظم سے ملنے کے لیے آیا اور ان کے کان میں کہا، "ناظم ابی (بڑے بھائی کو ترکی میں ابی کہا جاتا ہے)...... مجھے اس کام کے لیے رقم پیش کی گئی، لیکن میں کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہتا ابی۔ ہم نے ایسی بہت سی رقمیں دیکھی ہیں۔ لیکن میرے ناظم ابی کے لیے ایسی رقم وصول کرنا کس قدر شرم کا مقام ہے، کیا میں غلط کہہ رہا ہوں......؟ وہ احمق سمجھتا تھا کہ میں آسانی سے اس کے جال میں آ جاؤں گا۔ میں نے اسے صاف صاف کہہ دیا، "ارے احمق، جاؤ اور خود یہ کام کرو اگر تم میں جرأت ہے تو۔"

ایک اور موقع پر مجھے ایسے ہی ایک زیادہ خطرناک منصوبے کے بارے میں بتایا گیا۔ ناظم (جیل کے باغ میں) "Ülkem Insan Manzaraları" پر کام کر رہے تھے اور وہ جیل کی مرکزی دیوار کے ساتھ ساتھ چہل قدمی کرتے ہوئے اپنے ہاتھوں کو ہلا ہلا کر کچھ بڑبڑا رہے تھے اور چند قدم چلنے کے بعد واپس مڑ جاتے تھے۔

اس دوران اوپر کی منزل پر ایک کال کوٹھڑی میں بیڑیاں پہنے ہوئے تین مجرم ناظم کو

نیچے چہل قدمی کرتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ تینوں کو بیڑیاں ڈال کر قید تنہائی میں پھینکا گیا تھا، کیوں کہ تین روز پہلے انہوں نے جیل میں منشیات کی خرید وفروخت کے جھگڑے میں ایک قیدی کو قتل کر دیا تھا۔ اب وہ ناظم کے بارے میں باتیں کرتے ہوئے انہیں دیکھ رہے تھے۔

''وہ آدمی، تم اس آدمی کو دیکھ رہے ہو؟ اس کا نام تاریخ کی کتابوں میں آئے گا، میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں۔''

''ظاہر ہے، یہ بہت ذہین آدمی ہے، بہت پڑھا لکھا ہے......''

''کیا تمہیں پتا ہے میں کیا سوچ رہا ہوں۔ شیطان مجھے اُکسا رہا ہے کہ اسے مار ڈالوں......تم پوچھو گے کیوں؟ ہاں سنو، اگر تم کسی کو مارنا چاہتے ہو تو تمہیں اس جیسے آدمی کو مارنا چاہیے۔ دیکھو ہم لوگ کیا کرتے ہیں؟ ہم اٹھتے ہیں اور کسی گاؤدی کو مار ڈالتے ہیں اور ہمیشہ کے لیے جیل میں پھینک دیئے جاتے ہیں۔ لیکن اگر تم اس شخص کو قتل کر دیتے ہو تو پھر دنیا بھر کے اخبار تمہارے بارے میں لکھیں گے اور پھر تمہارا نام بھی تاریخ میں درج ہو جائے گا......''

''نہیں۔'' تیسرے مجرم نے کہا، ''یہ ہمارے ناظم آغا بے ہیں......ہم اُن کو قتل کرنے کے لیے اپنے آپ کو کیسے آمادہ کر سکتے ہیں؟''

مجھے یہ بات ایک مفلس قیدی نے بتائی جو اس جگہ کی صفائی وغیرہ کرتا تھا۔

''برائے مہربانی کمال ابی، ناظم ابی سے کہیں کہ وہ اپنا خیال رکھیں......وہ سوچ اور سمجھ سے بالکل عاری لوگ ہیں۔''

جب میں نے ناظم کو یہ بات بتائی وہ مسکرائے اور کہنے لگے، ''اچھا تو اس بات کو یقینی بنانے کے لیے اس کا نام تاریخ میں لکھا جائے، یہ شخص مجھے مار دے گا۔ جیسا کہ تاریخ میں نام لکھوانے کے لیے اور کوئی ایسا کام نہیں جو وہ کر سکتا ہو۔''

میں یہاں مختصراً یہ ذکر کرنا چاہوں گا کہ اس واقعے کے چند روز بعد وہ تینوں آدمی اناطولیہ میں مختلف جیلوں میں بھجوا دیئے گئے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے کہ ان تینوں کو نئی جیلوں میں پہنچنے کے فوراً بعد خنجر مار کر ہلاک کر دیا تھا...... جب ہم نے یہ خبر سُنی تو یہ ناظم ہی تھے جن کو ان کا بہت زیادہ افسوس ہوا تھا۔ وہ بہت دیر تک راہداری میں ٹہلتے رہے تھے۔

VII

1941ء اور 1942ء کے برسوں میں ہمیں بہت سے پژمردہ اور ناقابل برداشت دنوں کا سامنا کرنا پڑا، اور راتیں تو دن سے بھی بدتر تھیں........

جرمن بلٹس کرج عروج پر تھی۔ ان کی فوجیں بلغاریہ میں تھیں، اور ہم یہ سنتے رہتے تھے کہ آئندہ چند روز میں بلکہ ممکن ہے آئندہ چند گھنٹوں میں ہی وہ ترکی میں سے گزرگاہ کے حق کا مطالبہ کرنے والے ہیں۔ 1942ء خاص طور پر وہ سال تھا جب جیل میں جرمنوں کی حمایت ایک مقبول سوچ تھی۔ ہمیں بتایا گیا تھا کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ دشمن ہم پر حملہ کرے گا۔ ایک اور افواہ یہ گردش کر رہی تھی کہ پانچ سال اور اس سے کم سزا پانے والے قیدیوں کی فہرستیں تیار کر لی گئی ہیں۔ حملے کی صورت جیل خالی کر دی جائے گی اور قیدی وسطی اناطولیہ بھیج دیئے جائیں گے۔ ہمارے علم کے مطابق منصوبہ بندی اتنی پیشگی اور تفصیل سے طے کی گئی تھی کہ یہاں تک فیصلہ ہو چکا تھا کہ کس آدمی کو کس جیل میں بھجوانا ہے، ظاہر ہے متعلقہ احکامات پہلے ہی وصول ہو چکے تھے۔

ناظم کہہ رہے تھے، ''اگر یہ متشدد رجعت پسند کامیاب ہو جاتے ہیں تو انسانیت کم از کم ایک ہزار سال پیچھے چلی جائے گی اور اب تک حاصل کی گئی ہر چیز تباہ و برباد ہو جائے گی!'' اس کے بعد انہوں نے مزید کہا:

''لیکن جرمن شکست کھائیں گے...... یہ اٹل تاریخی حقیقت ہے۔''

گاہے گاہے ہمیں کوئی چھوٹی موٹی خبر ملتی رہتی تھی: جرمن، بلغراد میں داخل ہو گئے ہیں

اور تمام جوان لڑکیوں کو ٹولیوں کی صورت میں قحبہ خانوں میں پہنچا دیا گیا ہے یا کسی شہر کی کسی جیل میں جرمن آفیسروں نے فتح کے جشن میں شراب سے دھت ہو کر قیدیوں کو لٹکا کر پھانسیاں دے دیں یا یہ کہ گستاپو جب ہدف پر نشانہ لگانے کی مشق کرتے ہیں تو وہ قیدیوں کو ہدف کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔

ناظم اور میں اس قسم کی بات چیت میں حصہ نہیں لیتے تھے لیکن ہم میں سے کوئی بھی ان مظالم کو ذہن سے نکال نہیں سکتا تھا۔

کچھ قیدیوں کا خیال تھا کہ اگر ہٹلر فتح حاصل کرتا ہے تو ان کو فائدہ ہو سکتا ہے، اور ان لوگوں نے جیل کے ماحول کو آلودہ کرنا شروع کر دیا تھا۔

ایسے قیدیوں میں سے ایک مخلوط النسل قیدی بھی تھا جو کہ جیل کی درمیانی منزل پر ایک وارڈ میں رہتا تھا۔ وہ چھے فٹ چھے انچ کا تقریباً 110 کلوگرام وزنی ایک دیوہیکل انسان تھا۔ اس کی ماں ایک تاتاری خاتون تھی اور والد ترک تھا۔ اس کا بچپن، اس کا عنفوانِ شباب، حقیقت میں آخری چند برسوں کے علاوہ اس کی ساری عمر یورپ کے بڑے شہروں خاص طور پر سیوائے (Savoy) میں گزری تھی، اس کے باوجود اس کی گفتگو میں ہمیشہ ''ترک قوم کے قومی مفادات'' جیسے جملے شامل ہوتے تھے!

ایک انسان کے طور پر وہ ایک اچھا شخص تھا۔ وہ ناقابلِ یقین حد تک ایک سادہ لوح اور بھولا بھالا انسان تھا، اور ہمیں اکثر حیرانی ہوتی تھی کہ اس جیسا شخص کس طرح ''نازی فتح'' کا اس شدت سے حامی ہو سکتا ہے۔

کبھی کبھی وہ ''آزادی'' اور شائستہ موضوعات پر بھی بات کرتا تھا۔ وہ بہترین زبان بول سکتا تھا۔ وہ فنونِ لطیفہ میں دلچسپی رکھتا تھا۔ وہ ناظم کی شاعری کا بہت معترف تھا اور قدرے پرتخیل اور مہذب انسان تھا۔ ان تمام ''جمہوری'' اوصاف کے باوجود ''نازی فتح'' کی شدید خواہش رکھنے کی وجہ جیسا کہ وہ خود بتاتا تھا، یہ تھی کہ اس کی بہت سی رقم رومانیہ کے ایک بینک میں پڑی تھی جس کے اکاؤنٹ کو منجمد کر دیا گیا تھا۔ اگر جرمنی جیت جاتا تب ہی وہ رومانیہ جا کر اپنی رقم حاصل کر سکتا تھا۔

جیل میں اسے "Deve" یعنی ''اونٹ'' کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ سردیوں میں وہ سردی سے اپاہج ہو جاتا اور اپنے بستر سے اٹھنے کے قابل نہیں رہتا تھا، لہٰذا وہ نیچے ریڈیو سننے کے لیے نہیں جا سکتا تھا۔ ریڈیو ہر قیدی سن سکتا تھا اگر چہ یہ جیل انتظامیہ کے کنٹرول میں ہوتا تھا۔ لہٰذا ''اونٹ'' لوگوں کو نیچے جا کر خبریں سننے اور پھر اسے آ کر سنانے کے لیے رقم دیا کرتا تھا۔ جو شخص بھی روس میں جرمنی کی نئی پیش قدمی کی ''اچھی خبر'' سناتا، وہ اُسے بخشش بھی دیا کرتا تھا۔ نجاتی اور بوبی نیازی کو اس بخشش کا چسکا پڑ چکا تھا...... جب بھی خبریں نشر ہوتیں، وہ نئی فتوحات کی خبریں گھڑتے اور اسے بتاتے کہ جرمنوں نے نئے شہروں پر قبضہ کر لیا ہے اور پھر اپنی بخشش وصول کرتے۔ جب وہ بخشش وصول کر لیتے تو وہ آتے اور کہتے، '' آؤ، کیا تم اس سادہ لوح انسان کی رقم میں حصہ دار نہیں بننا چاہتے؟''

ہم اس وارڈ میں جمع ہو جاتے جہاں نجاتی اور بوبی نیازی رہتے تھے۔ بعض اوقات ناظم حکمت بھی ہمارے ساتھ ہوتے۔ کوئی ایک آدمی چائے بناتا اور سگریٹوں کی ڈبیاں ایک جگہ اکٹھی کر کے مشترکہ قرار دے دی جاتیں، اُس طرح سے ہم اس بخشش کو استعمال کرتے۔

''اونٹ'' کے بستر کی سرہانے دیوار پر سوویت روس کا ایک تفصیلی نقشہ آویزاں تھا اور اس نے اس پر جرمنوں کے تین طرفہ حملہ کو ظاہر کرنے کے لیے تین موٹے موٹے تیر کھینچ رکھے تھے۔ ہر روز تیر لمبے ہوتے رہتے تھے اور نجاتی اور بوبی دونوں کی باہمی کوششوں سے جن میں اونٹ کے اپنے جوش و جذبے کا بھی بڑی حد تک دخل تھا ایک سرخ تیر جو کہ تلا (Tula) تک پہنچ چکا تھا، جلد ہی ماسکو کو گھیرے میں لینے والا تھا۔

ناظم اس سے سوال کرتے:

''ارے اونٹ، میرا مطلب ہے میرے محترم، یہ سب تو بہت اچھا ہے۔ لیکن اگر ایک دن جرمن فوجوں کو پسپائی اختیار کرنا پڑا اور جنگ جرمنی کے اندر لڑی جانے لگی تو پھر کیا ہوگا؟''

ٹوٹی پھوٹی ترک زبان میں جو اس نے حال ہی میں سیکھی تھی، اونٹ جواب دیتا، ''کیا یہ ممکن ہے میرے پیارے! کیا یہ حقیقت میں ممکن ہو سکتا ہے؟''

اور وہ قہقہے لگانا شروع کر دیتا۔

وہ کہتا کہ وہ سٹالن گراڈ کی فتح کا بے چینی سے انتظار کر رہا ہے۔ اس نے وعدہ کر رکھا تھا کہ اگر سٹالن گراڈ فتح ہو گیا تو وہ ناظم اور مجھے شان دار چائے پلائے گا اور یوڈی کلون پیش کرے گا۔ (یہاں اور حان کمال نے حاشیے میں درج کیا ہے کہ جیل میں "راکی" کی جگہ یوڈی کلون پینے کا رواج بن چکا تھا۔ قیدی اس میں چینی اور لیمن شامل کر کے پیتے تھے۔ اس سے بھی "راکی" جیسا نشہ ہو جاتا تھا۔ لیکن بعد میں اس کا جیل میں داخلہ سختی سے ممنوع قرار دے دیا گیا تھا)۔

ہم کبھی کبھار اخبار بھی خریدا کرتے تھے یا ناظم کے گھر والے بھجوا دیتے تھے۔ اگر جیل انتظامیہ ریڈیو آن نہ کرتی یا قیدیوں کو خبریں سننے نہ دی جاتیں تو ہمارا بیرونی دنیا سے کوئی رابطہ نہ رہتا تھا۔ ہم اپنی کوٹھڑیوں میں بیٹھے رہتے جو گرمیوں میں ناقابل برداشت حد تک تپ جاتیں اور ہر جگہ کھٹملوں کا راج ہوتا اور سردیوں میں وہ برف خانے جیسی سرد ہو جاتیں۔ ہمارے شب و روز بس یونہی جلتے اور سرد ہوتے کٹ رہے تھے۔ اس سے بدتر بات یہ تھی کہ ہم حقیقی دنیا سے مکمل طور پر کٹے ہوئے تھے۔

جب بھی جرمن کوئی نیا طوفانی حملہ کرتے ہر قسم کے قیدی ریڈیو کے گرد جمع ہو جاتے۔ دیہات کے زمیندار، جنہوں نے موٹے گرم سمور والے کوٹ پہن رکھے ہوتے اور وارڈ 72 کے ننگے پاؤں، چیتھڑوں میں لپٹے غریب قیدی اور ان دونوں انتہاؤں کے درمیان تمام طبقات زندگی سے تعلق رکھنے والے مختلف پس منظروں اور عمروں کے افراد ریڈیو کے گرد ہجوم کیے ہوتے، ان کے کان ریڈیو سے جڑے ہوتے اور آنکھیں فرش پر جمی ہوتیں۔ وہ بڑے غور سے سن رہے ہوتے حالاں کہ اکثر اوقات وہ اچھی طرح سمجھ بھی نہیں پا رہے ہوتے تھے۔ ریڈیو صرف وہی خبریں نشر کرتا تھا جو وہ نشر کرنا چاہتا تھا۔

وہ یہ سب کچھ سن رہے ہوتے لیکن زیادہ تر لوگ جو سنتے تھے اسے سمجھ نہیں پا رہے ہوتے تھے اور وہ توقع کرتے تھے کہ جو لوگ "معاملات کو جانتے" ہیں، انہیں بھی سمجھا دیں۔

وہ کون لوگ تھے جو "معاملات کو جانتے" تھے؟ جیل کی اسی فیصد آبادی مکمل طور پر "مہذب" افراد پر مشتمل تھی، جو کہ جرمنوں کی کامیابیوں پر خوش ہوتے تھے۔ جب وہ جرمن فتوحات کا ذکر سنتے تو فخر محسوس کرتے، ان کے رویوں سے یوں ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ان کی ہر فتح کو

اپنی فوج کی فتح خیال کرتے تھے اور بڑا اطمینان محسوس کرتے تھے۔

ان سب میں اونٹ آگے آگے تھا، لیکن وہ ناظم حکمت اور میرے سامنے یا چیف وارڈر اور رجسٹرار کے سامنے، جو کہ ہماری طرح آخرکار اتحادیوں کی فتح پر یقین رکھتے تھے، تبصرہ کرنے سے احتراز کرتا تھا۔ البتہ دیہاتی اور زمیندار، خواہ ان کا کسی بھی علاقے سے تعلق تھا، آذربائیجان سے تعلق رکھنے والا نوجوان، سارجنٹ جو کہ منشیات فروخت کرتا تھا اور اپنے چاقو کے زور پر دھاک بٹھا کر جیل کافی شاپ کے انتظام و انصرام پر بھی قبضہ جمائے بیٹھا تھا، تمام کے تمام لوگ اونٹ کے پیروکار تھے، اور اسی کے وارڈ میں یا پھر آذربائیجان والے نوجوان کے وارڈ میں آتے جاتے تھے۔

نجاتی اور بوبی نیازی جو کچھ ہوتا ہمیں بتاتے رہتے تھے۔

جب بھی جرمن حملوں کی کامیابی ایسی ہوتی جو انہیں جوش مسرت سے بھر دیتی تو غرور سے ان کے سینے پھول جاتے اور وہ غل غپاڑہ کرتے ہوئے وارڈ میں جمع ہو جاتے، آذربائیجان والا نوجوان، جو بھی اس کا نام تھا، عمدہ ترین سبز یا سیلون کی چائے کا قہوہ تیار کرتا جو کہ وہ پیلے سیلوفین میں لپٹے ہوئے ڈبوں میں خاص طور پر اپنے ذاتی استعمال کے لیے لاتا تھا۔ اونٹ چاکلیٹ کے ڈبے، مٹھائی اور پستے سے بھری ہوئی ترک ڈیلائٹ (ایک جیلی کی شکل کی خصوصی ترک مٹھائی) پیش کرتا۔

وارڈرز کی بے تاثر نگاہوں کے عین سامنے، جو دراصل وہاں چائے، چاکلیٹ اور مٹھائی کا حصہ لینے پہنچے ہوتے تھے، اونٹ اپنی سرخ پنسل اٹھاتا اور اپنے مشہور نقشے پر سرخ تیروں کو جو تین طرفہ حملوں کی نشاندہی کرتے تھے، مزید لمبا کر دیتا۔ وہ اسے آگے سے آگے بڑھاتا جاتا، خوشی اور جذبہ مسرت سے اس کی آنکھیں گھوم رہی ہوتیں اور پسینے کے قطرے لگاتار بہہ رہے ہوتے۔

اس کے بعد انفرادی اظہار خیال، تبصروں اور تشریحات کا دور شروع ہوتا، تصدیق کے لیے سروں کو مثبت انداز میں جنبش دی جاتی اور ان ہاتھوں سے تالیاں بجائی جاتیں جو کہ عورتوں کے ہاتھوں کی طرح نرم و ملائم تھے، اگرچہ میں سمجھتا ہوں کہ کھردرے ہاتھ بھی ان تالیوں میں

ضرور شامل ہوتے ہوں گے۔

جب یہ سب کچھ ہو رہا ہوتا، میں اور ناظم اپنے برف جیسی ٹھنڈی کوٹھڑی میں خاموش بیٹھے ہوتے، بغیر ایک دوسرے سے کوئی بات کیے ہم ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھ رہے ہوتے۔ ناظم برہمی کے ساتھ اپنے پائپ سے کش لگا رہے ہوتے، ان کی آنکھیں بے تاب انداز میں دائیں بائیں گھوم رہی ہوتیں جو کہ ان کے پریشان ہونے کی علامت تھی۔ لیکن پھر، حتیٰ کہ مایوسی کے سیاہ ترین دنوں میں بھی وہ اچانک پھٹ پڑتے، ''نہیں کبھی بھی نہیں، یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ اتحادیوں کو شکست دی جا سکے۔ تاریخ اپنا راستہ تبدیل نہیں کرے گی......''

ان مایوسی بھرے دنوں میں ریڈیو کے آس پاس رہتے ہوئے، ناظم دیواروں پر مسلسل تصویریں بناتے رہتے تھے، وہاں مختلف چہروں کا مجموعہ بن گیا تھا، چہرے جو "Mephistopheles" (فاؤسٹ کی جرمن کہانی کا شیطان) کی یاد دلاتے تھے، جو کہ اپنے بدوضع ناکوں، گھورتی ہوئی وحشی آنکھوں اور بڑے بڑے کانوں کے ساتھ بداندیش اور افسردہ نظر آتے تھے۔

آخرکار، سٹالن گراڈ کے دفاع کے بعد، جب جرمن فوجوں نے پسپائی اختیار کی، اونٹ اور اس کے دوست خوف اور اضطراب کا شکار ہو گئے اور اونٹ کی تو پوری طرح سے ٹی گم ہو گئی۔ تشویش اور پریشانی نے اسے گھیر لیا، اس کی سوچوں پر رنج و غم غالب آ گیا۔ جرمنوں کی پہلی پسپائی کے ساتھ اس کی نیند میں خلل آنا شروع ہو گیا، اور اس کی بے خوابی نے اس کی تمام خوشیاں نچوڑ لیں اور اس کی ٹانگوں کے درد اور اذیت میں شدت پیدا ہو گئی۔

اب ریڈیو کے گرد ہجوم میں بھی کمی آ گئی تھی اور خبریں نشر ہونے کے بعد میں اور ناظم حکمت، اونٹ کے وارڈ میں جاتے اور اس کے بستر کے سرہانے لگے ہوئے نقشے پر پسپائی کی نشاندہی کرتے۔ ناظم نئے تیر کھینچنے کے لیے پنسل استعمال کرتے جو کہ ان سرخ تیروں سے مخالف سمت میں جا رہے ہوتے جو جرمنوں کے گزشتہ طوفانی حملوں کی پیش قدمی کو ظاہر کر رہے تھے۔ پنسل سے بنے ہوئے نئے تیر ہر روز لمبے ہوتے چلے جا رہے تھے۔ اونٹ اس پسپائی کو بڑی خواری اور ناپسندیدگی سے قبول کر رہا تھا۔ اس کی آنکھیں اس کے گول اور احمقانہ چہرے پر اندر کو

دھنسی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔

لوگ اونٹ سے سوال کرتے کہ جرمنوں کی پسپائی کی کیا وجوہات ہیں، گویا کہ جرمن فوجوں کی ناکامی کا وہی ذمہ دار ہو۔ بات اس حد تک بڑھ گئی کہ وہ پوری جیل میں مذاق کا نشانہ بن چکا تھا..... وہ اس کی ٹوپی اتار لیتے، کاغذ کی پونچھیں کاٹتے اور اس کے کوٹ کے پیچھے چسپاں کر دیتے اور یہاں تک پہنچ جاتے کہ (میں اس ذکر پر معافی چاہوں گا) وہ اس کی پشت کو انگلیوں سے چھیڑتے۔

آخر میں "چلک دار وفاع" کی کچھ باتیں شروع ہو گئیں، جو کہ نام نہاد سٹر۔ یجک ماہرین کی اختراع تھی۔ اس نے جیل میں جرمنی کی حامی اہم شخصیات کو کچھ حوصلہ بخشا، لیکن یہ زیادہ عرصہ قائم نہ رہ سکا۔ تاہم پھر بھی جب تک جرمنوں نے آخر کار غیر مشروط طور پر ہتھیار نہ ڈال دیے، بہت سی اُول جلول قسم کی باتیں کی جاتی رہیں! پوشیدہ ہتھیاروں سے لے کر سپین میں ریزرو فوجیوں تک جو کہ ایک اشارے پر میدان عمل میں اترنے کو تیار تھے، بے سروپا افواہیں اڑائی جاتی رہیں۔

پھر وہ نتیجہ سامنے آ گیا جس سے ہم سب آگاہ ہیں...... جوں جوں جرمن شکست زیادہ یقینی ہوتی چلی گئی، اونٹ بتدریج اتحادیوں کے زیادہ قریب ہوتا چلا گیا۔ اتحادیوں کی فتح کے ساتھ وہ اتنا زیادہ "ڈیموکریٹ" بن چکا تھا جتنا کہ ہمارے بہت سے مشہور فاشسٹ مصنفین ہیں!

O

ناظم اپنے اردگرد کے لوگوں کی مدد کر کے بہت خوشی محسوس کرتے تھے۔ لوگ اس بات کو سمجھتے تھے اور وہ اکثر ان سے رقم ادھار مانگا کرتے۔ اکثر اوقات اگرچہ ان کے اپنے پاس کوئی رقم نہ ہوتی، وہ جاتے اور دوسرے لوگوں سے ادھار رقم لے کر ان لوگوں کو دے دیتے جنہوں نے مدد مانگی ہوتی۔ یہ بات یہاں تک بڑھ گئی تھی کہ مجھے یاد ہے کہ جیل کے چند نگران بھی ناظم کے قرض دار تھے لیکن جو مدد وہ کرتے، وہ صرف پیسے دھار دینے تک ہی محدود نہ ہوتی تھی۔

بہت سے قیدی مختلف بہانے تراشتے رہتے تھے تاکہ ڈاکٹر ان کے لیے حمام تجویز کر دے یا پھر اگر ان کے پاس تھوڑی سی رقم ہوتی تو انہیں کسی دندان ساز یا ہسپتال میں ایکس رے

کے لیے بھجوا دے۔ حقیقت میں یہ ہر روز ایک جیسی ہی پتھر کی دیواریں، کنکریٹ کی راہداریاں اور لوہے کی سلاخیں، آسمان کا وہی ایک حصہ، وہی پہاڑی سلسلہ اور کم و بیش سال ہا سال تک وہی چہرے دیکھ دیکھ کر پیدا ہونے والی اکتاہٹ اور تھکاوٹ سے وقتی نجات حاصل کرنے کا ایک ذریعہ تھا۔ یہ باہر کی ہوا میں سانس لینے کا ایک بہانہ تھا، جس کا مزہ وہ تقریباً بھول چکے تھے۔ اس کام کے لیے انہیں ڈاکٹر یا پراسیکیوٹر یا پھر کم از کم جیل کے گورنر سے اجازت حاصل کرنا ہوتی تھی۔ اکثر قیدیوں کے لیے ڈاکٹر، پراسیکیوٹر یا گورنر ایسی ذی اقتدار ہستیاں تھیں جن کے سامنے بولنا ہرگز ان کے بس میں نہ تھا۔ یہ بہت اہم اور بڑے لوگ تھے جن کے سامنے جاتے ہوئے قیدی پسینے میں شرابور ہونے، کانپنے اور لکنت کا شکار ہو جانے کی توقع رکھتے تھے۔ ان ہستیوں کے سامنے اجازت حاصل کرنے کے لیے بات کرنا ان کے بس کی بات نہ تھی...... ایسے موقعوں پر وہ ناظم کے پاس آ جاتے تھے۔

''استاد، ڈاکٹر کو بتائیں کہ مجھے کس چیز کی ضرورت ہے۔ اسے بتائیں کہ فلاں بن فلاں کو حمام میں جانے کی ضرورت ہے۔ آپ جیسے بہتر سمجھتے ہیں بات کر لینا...... آپ ہماری طرح جاہل تھوڑے ہی ہیں۔''

''ٹھیک ہے، بیٹا! اگر اس نے کہا، کیا فلاں بن فلاں کے منہ میں زبان نہیں ہے؟ کیا تم اس کے قانونی نمائندے ہو؟''

''نہیں وہ ایسا نہیں کہے گا استاد، کم از کم آپ کو یہ نہیں کہہ سکتا، وہ آپ کی عزت کرتے ہیں۔ آپ عمدہ الفاظ استعمال کر سکتے ہیں جیسے کہ وہ رات کو سو نہیں سکتا، وہ رات بھر کراہتا اور ہائے ہائے کرتا رہتا ہے، آپ بہتر جانتے ہیں کہ کیا کہنا ہے!''

چار و ناچار ناظم جاتے اور ظاہر ہے تفصیل سے بتاتے ہوں گے۔ وہ ''اہم اور بڑے لوگوں'' سے آمنے سامنے بات کرتے اور اجازت لے آتے۔

بعض اوقات اجازت تو مل جاتی لیکن اب بات ڈیوٹی پر موجود سپاہی کے سر ہوتی اور گارڈ روم میں کوئی سپاہی موجود نہ ہوتا جو ساتھ جا سکے۔ اس صورتِ حال میں عام طور پر یہ خیال کیا جاتا کہ گارڈ روم کا انچارج آفیسر محض بہانے کے طور پر کہہ رہا ہے کہ ''میرے پاس کوئی سپاہی نہیں

ہے!''

وہ دوبارہ ناظم کے پاس آ جاتے۔''خدا کے لیے استاد! آپ نے مجھ پر بہت احسان کیا ہے۔ آپ ذرا آخر تک اس کا خیال رکھیں۔ سارجنٹ کہتا ہے کہ میرے پاس کوئی سپاہی نہیں ہے، یہ اب آپ پر منحصر ہے، برائے مہربانی میرے ساتھ چلیں۔''

ناظم حکمت اپنے پائپ کے کش لگاتے ہوئے تیزی سے اٹھتے، سیڑھیاں چڑھتے، اترتے، خاردار جنگلوں سے اور مقفل دروازوں سے گزرتے، لوگوں سے درخواست کرتے ہوئے ایک سے نکلتے دوسرے میں داخل ہو جاتے اور پوری کوشش کرتے، یہاں تک کہ کوئی نہ کوئی بندوبست کر دیتے۔

انہوں نے کبھی بھی ایسی درخواستوں کو رد نہیں کیا تھا جس میں سارا کام انہوں نے خود کرنا ہوتا تھا، مثلاً اپیلیں لکھنا یا قانونی نظرثانی کی درخواستیں تحریر کرنا یا دوسرے اسی طرح کے کام جو اُن سے شروع ہو کر ان پر ہی ختم ہو جاتے تھے۔

اُن کا لوگوں کے ساتھ تعلق صرف اس قسم کے کاموں تک ہی محدود نہیں تھا۔ مثال کے طور پر وہ گارڈ روم کے نگران سارجنٹ کو باقاعدگی سے پینٹنگ کی تربیت دیتے تھے، جیل کے رجسٹرار کے سالے کا انہوں نے ایک بڑا سا پنسل سکیچ تیار کر کے دیا تھا۔ وہ رجب (Recep) کی ہلکی پھلکی چھیڑ خانی کو بھی نظر انداز کر دیتے تھے جب وہ اس قسم کے سوالات کرتا، ''استاد! دنیا کدھر جا رہی ہے؟'' رجب ایک بچہ تھا جو ہسپتال کے باورچی کا مددگار تھا۔ ناظم پوری سنجیدگی سے اسے تفصیل سے جواب دیتے، یا جب ہٹا کٹا سابقہ پہلوان، جو کہ اپنی حماقت کی وجہ سے جیل میں ہمیشہ مذاق کا نشانہ بنا رہتا تھا، ان پر چڑھ دوڑتا، ''...... بھائی، تم نے میری اپیل تحریر کی تھی لیکن اس کا ہمیں کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ انہوں نے اصل فیصلہ برقرار رکھا ہے...... اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟'' ناظم یہ کہتے ہوئے ترکی بہ ترکی جواب دے سکتے تھے، ''...... پھر کیا ہوا؟ کیا میں نے اس کے لیے تم سے کوئی رقم لی تھی؟ تم نے تو اس پر لگائے گئے کورٹ ٹکٹ کی رقم بھی نہیں دی تھی، تمہیں یہ بات کرتے ہوئے شرم آنی چاہیے۔'' لیکن وہ ایسا جواب نہیں دیتے تھے۔ اس کی بجائے وہ پہلوان کی بات شروع سے آخر تک غور سے سنتے، اسے پوری طرح تسلی دیتے اور مشورہ

دینے کی کوشش کرتے۔ ان کے لہجے میں ایک ایسے شخص کی بے چینی کا شائبہ تک نہ ہوتا جو اس کی باقی رہ جانے والی چھے ماہ کی قید کی نسبت 28 سال کی قید کے بوجھ تلے دبا ہوا ہو، بلکہ یوں محسوس ہوتا تھا گویا وہ خوش حال زندگی بسر کرنے والے ایک خوش باش انسان ہوں جو آزادانہ گھوم پھر رہے ہوں۔ اس دوران میمش (Memiş) جو کہ نگران تھا اپنی تنگ موری والی پتلون پہنے آ سر نکلتا، اس کی پتلی پتلی ٹانگیں اس کے بہت زیادہ پھولے ہوئے پیٹ میں جو یوں نظر آتا تھا کہ ہوا بھری ہوئی ہو، دھنسی ہوئی نظر آتیں۔ آتے ہی وہ سوال کرتا ''ڈبل روٹی کا ایک ٹکڑا اگر کوئی پڑا ہوا ہو۔'' میمش ذیابیطس کا مریض تھا اور ڈبل روٹی کا ایک لقمہ بھی اس کے لیے زہر قاتل تھا۔ لیکن کیا میمش یہ بات سمجھتا؟

لہٰذا ناظم حکمت اس کی طرف متوجہ ہوتے اور اسے سمجھانے کی کوشش کرتے کہ ایسی غذا کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا بھی اس کے لیے نقصان دہ ہوگا۔ وہ اسے یہ بات سمجھانے کی پوری کوشش کرتے اور بولتے بولتے ہلکان ہو جاتے، ان کا پائپ بجھ جاتا اور اس دوران انہیں کئی بار اسے سلگانا پڑتا۔ اس ساری گفتگو کے بعد کوڑھ مغز میمش اپنی دھنسی ہوئی پژمردہ آنکھیں پوری طرح پھاڑ کر کھولتا اور کہتا: ''بہتر تھا کہ مجھے ایک ٹکڑا دے دیتے، اگر کوئی موجود ہے، میں بھوک سے مر رہا ہوں......''

اتنے میں کہیں سے اونٹ آن دھمکتا...... اور لبرل ازم اور سوشلزم، آزادی کی جو تشریح کرتے ہیں اس میں پائے جانے والے فرق پر بحث شروع ہو جاتی۔ لیکن اونٹ اس فرق کو سمجھنے میں طیش دلانے کی حد تک نااہلی کا مظاہرہ کرتا۔

ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ چیف وارڈر اور ڈپٹی وارڈرز دونوں محبت میں گرفتار ہو گئے...... چیف وارڈر خواتین کی جیل میں ایک قیدی خاتون کی محبت میں اور اس کا ڈپٹی اسی جگہ ایک خاتون وارڈر کی محبت میں...... خواتین کی جیل ایک چھوٹی سی عمارت تھی جو کہ جیل کے بڑے باغ کے ایک کونے میں واقع تھی۔ جب مرد قیدیوں کو ہوا خوری کے لیے باہر نکالا جاتا تو خواتین قیدی دروازوں کی جھریوں اور سوراخوں سے دیکھتی رہتیں یا خاتون وارڈر کے دفتر میں آ جاتیں اور اس کی کھڑکی سے تاک جھانک کرتی رہتیں۔ جب مرد قیدی اپنے وارڈوں میں بند کر دیئے جاتے اور

خواتین قیدیوں کو ہوا خوری کے لیے باہر نکالا جاتا تو مرد قیدی وارڈوں کی کھڑکیوں سے انہیں دیکھتے رہتے۔ اس طرح مرد اور خواتین ایک دوسرے کو بہت اچھی طرح جانتے تھے۔

جب خواتین اپنی باری پر باہر آ رہی ہوتیں تو مردوں کی وارڈوں کی کھڑکیاں ایک دوسرے کے ساتھ دھنس کر کھڑے آدمیوں سے بھری ہوتیں۔ رومال ہلائے جاتے، ٹھنڈی سانسیں اور آہیں بھری جاتیں اور کاغذوں کے پرزے نیچے پھینکے جاتے۔ میں پتلی پتلی ٹانگوں والی کسی حد تک بدصورت اُس قیدی خاتون کو کبھی نہیں بھول پایا، وہ دوسری خواتین کی نسبت بہت زیادہ ہوشیار اور چالاک تھی۔ اس نے دو سپاہیوں اور کم از کم چھتیس کے قریب مرد قیدیوں کو دوستی کے جال میں پھانس رکھا تھا۔ ہم نے سنا تھا کہ اس نے یکے بعد دیگرے اپنے سارے عاشقوں کو کنگال کر دیا تھا اور بڑی آرام دہ زندگی بسر کر رہی تھی۔ ہمیں یہ بات اس لیے پتا چل گئی تھی کیوں کہ بوبی جو کہ اس خاتون اور اس کے عاشقوں کے درمیان پیغام رسانی کی خدمات انجام دیتے ہوئے بچولیے کا کردار ادا کرتا رہا تھا، وہ میرا اور ناظم دونوں کا دوست تھا۔

ایک روز چیف وارڈر کی بیوی کو ایک قیدی خاتون کے ساتھ اپنے خاوند کے تعلقات کا علم ہو گیا۔ وہ آندھی طوفان کی طرح جیل میں داخل ہوئی اور سیدھی اپنے خاوند کے دفتر میں پہنچ گئی۔ وہ چیختی چلاتی اور گرجتی برستی ہذیان بکتی چلی گئی۔ وہ اپنے غصے پر قابو نہ رکھ سکی تھی اور اس نے آئینے، شیشے، جگ، گلاس اور کھڑکیوں کے شیشے سب کچھ توڑ ڈالا۔

چیف وارڈر پوری طرح لرز اور کانپ رہا تھا۔ اس کے چہرے کا تمام خون نچڑ چکا تھا، جو کہ لیموں کی طرح زرد رنگ کا ہو گیا تھا۔

''استاد، اب سب کچھ آپ پر منحصر ہے۔'' اس نے کہا، ''میں ختم ہو چکا ہوں، اُسے قیدی خاتون سے میرے تعلقات کا علم ہو گیا ہے اور وہ یہاں آ گئی ہے اور اس نے ہر چیز جو اس کے ہاتھ لگی توڑ پھوڑ ڈالی ہے...... میں مکمل طور پر برباد ہو گیا ہوں۔ جائیں اور اسے ٹھنڈا کریں، میں آپ سے التجا کرتا ہوں۔''

ناظم اس وقت اپنے بستر پر آرام سے لیٹے ہوئے تھے، ان کا پائپ ان کے منہ میں تھا اور وہ آگاتھا کرسٹی کا فرانسیسی ناول پڑھ رہے تھے۔ جب وہ لکھنے سے یا شاعری سے اکتا جاتے

تھے تو وہ پینٹنگ یا مصوری شروع کر دیتے یا پھر سنسنی خیز ادب پڑھتے تھے۔

صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ فیصلہ نہیں کر پا رہے کہ چیف وارڈر کی اس درگت پر ہنسیں یا روئیں۔ ''اوہ میرے خدا!'' انہوں نے کہا، ''چیف کیا میں نے تمہیں خبردار نہیں کیا تھا؟''

وہ کافی دیر بعد واپس آئے اور جو کچھ ہوا تھا ہمیں بتایا۔ ''اس قسم کے الفاظ کے ساتھ کہ یہ بات کسی طور پر سچ نہیں ہو سکتی، یقیناً آپ کو کسی نے جھوٹ بتایا گیا ہوگا، چیف ایک اچھا انسان ہیں، وہ ایسا ہے، وہ ویسا ہے...... ہم نے خاتون کو ٹھنڈا کیا اور اسے اپنے خاوند کے ساتھ صلح کرنے پر مجبور کیا۔ جب ہم صلح صفائی کروا رہے تھے، ڈپٹی چیف وارڈر پوری طرح اپنی دنیا میں کھویا ہوا تھا، اس تمام طوفان، شیشے ٹوٹنے اور غل غپاڑے سے بے خبر۔ وہ اوپر جیل کی جانب جانے والی پتھر کی سیڑھیوں کے جنگلے کے پائے کے سہارے کھڑا تھا۔ اس کی آنکھیں خاتون وارڈر کی کھڑکی کے سفید پردے پر جمی ہوئی تھیں، اور جب میں نے اس کے کندھے کو ٹھوکا دیا تو اس نے کوئی حرکت نہ کی۔ وہ کسی سحر میں گرفتار نظر آ رہا تھا۔ میں نے اسے بازو سے پکڑا اور اسے چیف وارڈر کے دفتر میں لے گیا۔ تمہارا کیا خیال ہے اس نے کیا ردعمل ظاہر کیا ہوگا؟'' ''یہ سب کیا ہے؟'' اس نے پوچھا، ''یہ شیشے کیوں ٹوٹے پڑے ہیں؟ یہ آئینہ کیوں چور چور ہوا پڑا ہے؟'' ''

جن دنوں چیف وارڈر چھٹی پر ہوتا، اس کا ڈپٹی شام کے وقت ناظم کو اپنے پاس بلا لیتا، وہ کافی اور سگریٹ پیتے اور ڈپٹی ''اپنی محبت'' کے بارے میں ناظم سے تفصیلی باتیں کرتا۔ بعض اوقات ان شاموں میں میں بھی حصہ لیتا۔ صاف و شفاف رات، چمکتا ہوا چاند اور بڑے بڑے ستارے یقیناً ہر کسی کو محبت کے بارے میں سوچنے پر اکسانے لگتے۔

VIII

ناظم کی بیوی پیرائے بھابی سال میں دو مرتبہ یا زیادہ سے زیادہ تین مرتبہ ان سے ملنے کے لیے آتی تھیں۔ اگر ان کے پاس کچھ پیسے ہوتے تو وہ چند دنوں کے لیے ہوٹل میں قیام کرتیں۔ اس وقت ناظم دیکھنے والے ہوتے! وہ بے حد خوش ہوتے۔

پیرائے بھابی جیسے ہی ریل گاڑی سے اترتیں، فون کرتیں یا ہوٹل میں ٹھہرنے سے پہلے سیدھی جیل آتیں اور جب جیل کی رسمی کارروائیاں مکمل ہو جاتیں، وہ اور ناظم وارڈر کے دفتر میں یا گورنر کے دفتر میں آمنے سامنے بیٹھ جاتے۔

ناظم اپنی بیوی کی بہت زیادہ عزت کرتے تھے۔ ان کی اپنی بیوی کے لیے محبت اور عزت واحترام عام خاوندوں کی نسبت بالکل مختلف تھا۔ بعض اوقات وہ جو خط انہیں لکھتے مجھے بھی پڑھاتے۔ یہ خط اگرچہ نثر میں ہوتے تھے لیکن شاعری سے بھرے ہوتے، تکلفات سے خالی اور خلوص سے بھرے ہوئے، انتہائی پرخلوص اور سادہ الفاظ پر مشتمل ہوتے۔ یہ پڑھنے والے کو آسودگی کا ایک احساس اور لطف وانبساط عطا کرتے اور خواہ وہ انتہائی مایوسی کے عالم میں ہوتا۔ اسے زندگی سے محبت اور خوش حالی کا پیغام دیتے۔ وہ اپنے آپ میں ایک نئی توانائی محسوس کرتا۔

پیرائے بھابی کے لکھنے کے انداز میں ناظم کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ ان کی تحریر میں ایک ایسی خاتون نظر آتی جو تصنع سے پاک اور پرعزم ہو اور اس بات کا شعور رکھتی ہو کہ وہ ایک ''عظیم شاعر'' کی بیوی ہے، اور یہ بھی سمجھتی ہو کہ وہ اپنے خاوند کی وجہ سے ایک تاریخی حیثیت رکھتی

ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ اپنی ذاتی شناخت پر بھی فخر کرتی ہو۔

ناظم ان کے خط بڑی توجہ سے سنبھال کر رکھتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ روزمرہ کے معمول کے واقعات جوان میں بیان کیے گئے تھے انہوں نے ان کی مشہور نظم "Ülkem Insan Manzaraları" کے لیے بنیادی مواد مہیا کیا۔ ان کی بیوی کے پرسکون، باضابطہ طرزِ عمل اور گفتگو کے مقابلے میں ناظم، مجھے الفاظ نہیں مل رہے، وہ مضطر اور غیر سنجیدہ شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی گفتگو مجھے بلبل کی نغمہ رسائی کی یاد دلاتی تھی۔ جب وہ ایک دوسرے کے مقابل بیٹھے ہوتے بھابھی منضبط، باوقار اور سنجیدہ ہوتیں جب کہ ناظم بولنے کے ساتھ اپنے ہاتھوں سے مسلسل اشارے کر رہے ہوتے اور لگاتار بولتے چلے جاتے۔ ان کی نگاہیں اپنی بیوی سے کبھی بھی نہ ہٹتیں۔ وہ سر کو بلند رکھ کر محض سن رہی ہوتیں۔ مَیں تصور کرتا، ان کے درمیان بات چیت اس طرح کی ہوتی ہوگی۔

"دیکھو، ناظم تم نے اپنے کپڑے پھر گندے کر لیے ہیں!"

"اوہ، میری جان معاف کر دو۔ دوبارہ ایسا نہیں ہوگا!"

"اگر وہ ایک مرتبہ، صرف ایک مرتبہ مجھے "عزیز از جان! ناظم" کہہ کر بلائے یا اپنے کسی خط میں یوں مخاطب کرتے تو پھر ساری دنیا میری ہو گی۔ لیکن وہ ایسا نہیں کرے گی...... بدبخت خاتون!"

یوں نظر آتا تھا کہ گویا پیرائے بھابی ایک استانی ہیں اور ناظم کسی پرائمری سکول کے کوئی شرارتی شاگرد ہیں جو گرد میں لوٹنیاں لیتا رہتا تھا، گرمی اور پسینے میں نہاجاتا اور پھر برف جیسا یخ پانی پینے لگتا تھا۔

اپنی بیوی کی باتیں سنتے ہوئے وہ دنیا کے خوش باش ترین انسان دکھائی دیتے تھے، اور اس بات میں کوئی شک نہیں تھا، ان کی بیوی جو کہتیں وہ ممکنہ حد تک تازہ ترین، اصل اور دلچسپ باتیں ہوتیں......

اس وقت تک مَیں کام کے لیے جیل سے باہر جانے لگا تھا۔ لیبر لاء میں قیدیوں سے کام لینے کی شق موجود تھی، جس کے تحت مَیں دوسرے بہت سے قیدیوں کے ساتھ صبح سویرے

روانہ ہوتا اور سہ پہر ڈھلے یا شام کو واپس آتا تھا۔ ایک دن جب مَیں کام سے واپس آیا تو مَیں نے ناظم کو سیڑھیوں کے جنگلے کے اُسی پائے کا سہارا لیے تقریباً رو دینے کے قریب کھڑے دیکھا، جہاں چیف وارڈر کھڑا رہتا تھا جب وہ خاتون وارڈر کے دفتر کی سفید پردوں والی کھڑکی کو دیکھ رہا ہوتا تھا۔

مَیں ان کی جانب گیا اور ان کے بالکل نزدیک جا کر کھڑا ہو گیا لیکن انہیں میری موجودگی کا احساس تک نہ ہوا۔ عام طور پر وہ مجھے دروازے پر ہی خوش آمدید کہتے اور میرا پر جوش شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنے وہ تحائف وصول کرتے جو گاہے بہ گاہے مَیں ان کے لیے لایا کرتا تھا۔ مثلاً ابلی ہوئی وسلنگ مٹھائی (ایک مخصوص مٹھائی جس میں سوراخ ہوتے ہیں اور پھونک مارنے سے سیٹی کی طرح آواز نکلتی ہے) بھنے ہوئے چک پیز یا بادام اور خاص طور پر سگریٹ جو جیل کے باہر سے خریدے گئے ہوتے۔ وہ بہت خوش ہوتے، قہقہے لگاتے اور باہر کی جو باتیں مَیں سناتا، بڑے غور سے سنتے۔

یہ عجیب بات تھی کہ وہ اس طرح بے حس و حرکت کھڑے تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ ان کی بیوی پہنچ چکی تھیں۔ کیا کوئی تصور کر سکتا تھا؟ اُن کی بیوی آئی ہو اور ناظم فرحاں و شاداں نہ ہوں اور خوشی سے گنگناتے نہ پھر رہے ہوں جیسا کہ عام طور پر ہوتا تھا۔

مَیں نے ان سے پوچھا کہ کیا ہوا ہے۔ اُنہوں نے محض کندھے اچکائے، ایک ٹھنڈی سانس بھری اور ڈوبتے ہوئے سورج کی جانب دیکھنے لگے، اُن کے چہرے سے ایسی اداسی جھلک رہی تھی کہ میرا دل بے تاب ہو گیا۔ مَیں نے ان سے بار بار پوچھا، مَیں نے زور ڈالا، ان سے التجا کی، آخر کار حقیقت چھپانے کی اُن کی تمام تر کوششوں کے باوجود مَیں ان سے اگلوانے میں کامیاب ہو گیا۔

پیرائے بھابی نے معمول کے مطابق فون کر کے انہیں بتایا تھا کہ وہ ہوٹل میں پہنچ چکی ہیں اور بہت تھکی ہوئی ہیں اس لیے اگلے دن جیل آئیں گی۔ گفتگو کے دوران ناظم نے کہا، ''یہاں جیل کا رجسٹرار اس ہوٹل کو اچھا نہیں سمجھتا۔ یہاں مت ٹھہرو کسی دوسرے ہوٹل میں چلی جاؤ۔''

شاید کیوں کہ وہ تھکی ہوئی تھیں، پیرائے بھابی اپنی بات پر ڈٹی رہیں اور کہا، ''نہیں،

مَیں اس ہوٹل میں اس وقت سے قیام کر رہی ہوں جب مَیں بچی تھی (ظاہر ہے اپنے والدین کے ہمراہ) اور مَیں نے اس کے بارے میں کبھی کوئی ایسی بات نہیں سُنی ۔ مجھے کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ مَیں اپنا ہوٹل تبدیل کروں ۔"

"تم ہوٹل تبدیلی کرو گی ۔"، "تم تبدیل نہیں کرو گی ۔"، "نہیں ، مَیں بس اب یہیں ٹھہری رہوں گی ۔"، "نہیں تم یہاں نہیں رہو گی ۔" مختصراً بھابی نے جہاں تھیں وہیں رہنے پر اصرار کیا ۔ ناظم حقیقت میں ناراض ہو گئے ۔ "اگر یہ بات ہے تو مجھے ملنے مت آنا ۔" انہوں نے کہا ، "جہاں سے آئی ہو وہیں واپس چلی جاؤ ۔"

بس اتنی سی بات تھی ۔

تاہم ناظم اسے ایک اصولی بلکہ کسی حد تک عزت کا معاملہ بنائے بیٹھے تھے ۔

"جب تک وہ اُس ہوٹل میں ٹھہری ہوئی ہے ، مَیں اس سے کوئی بات نہیں کروں گا ۔"

اس رات وہ بڑی دیر تک جاگتے رہے ، شمار اور تخمینے لگاتے رہے ، اپنے ذہن میں انہیں جانچتے سمیٹتے رہے ۔ پائپ کے بعد پائپ بھر بھر پیتے رہے اور کوٹھری میں ٹہلتے رہے ۔ ان کی کھڑاویں مسلسل فرش پر بج رہی تھیں ......

دوسری صبح بہت تڑکے ہی نجاتی پھولے ہوئے سانس کے ساتھ تیزی سے اندر آیا ، اس کی آنکھیں ابھی تک نیند سے بوجھل تھیں اور بال بکھرے ہوئے تھے ۔

"استاد ، بہت اچھی خبر ہے ، بھابی آئی ہیں ۔"

ناظم بستر میں تھے ۔ اُن کا چہرہ سرخ ہو گیا ۔ ہم نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا ۔ وہ مجھ سے پوچھنا چاہ رہے تھے کہ "تمہارا کیا خیال ہے ؟" اور مَیں انہیں کہنا چاہتا تھا ، "آپ کو اُن سے ملنے جانا ہی پڑے گا ۔ اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں !"

نجاتی اصل صورتِ حال سے بالکل بے خبر تھا ، اس نے الم غلم کہنا اور ہاتھوں کو نچانا جاری رکھا ۔ کوئی اور موقع ہوتا تو ناظم اس کو اس حالت میں دیکھ کر بے اختیار قہقہے لگانے لگتے ۔

نجاتی چلا گیا ۔

"جاؤ اور اسے کہہ دو ۔" ناظم نے کہا ، "جاؤ اور اسے کہہ دو کہ اپنے استنبول واپس چلی

جائے......"

لیکن مَیں سمجھ رہا تھا کہ ان کا اصل مطلب یہ تھا کہ "جو مَیں کہہ رہا ہوں اس کی پرواہ مت کرو۔ اپنے طور پر معاملہ طے کرو۔ مجھے تنہا چھوڑ دو اور کچھ دیر یہ ناٹک کر لینے دو کہ مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں۔" مجھے ان کے نتھنے پھڑ پھڑاتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

مَیں نیچے گیا، یہ بہت ہی صبح صبح کا وقت تھا، ابھی تک گورنر اور نہ ہی رجسٹرار وہاں پہنچے تھے اور اتفاق یہ ہوا کہ اس روز چیف وارڈر بھی چھٹی پر تھا۔

نجاتی نے پوچھا، "انہوں نے دلچسپی کیوں نہیں دکھائی۔"

"مَیں تمہیں بتاؤں گا، انہوں نے کہا ہے اسے واپس استنبول چلا جانا چاہیے، مَیں نیچے نہیں آ رہا۔"

نجاتی نے ایک بلند قہقہہ لگایا، "اف، ذرا ناظم حکمت کو تو دیکھو، کیا تم سمجھتے ہو کہ وہ واقعی سنجیدہ ہیں؟"

"اس بات کو چھوڑ دو۔" مَیں نے کہا، "وہ محض ناٹک کر رہے ہیں!"

کافی انتظار کے بعد سب سے پہلے گورنر آیا۔ اس کے فوراً بعد رجسٹرار بھی آ گیا۔ ہم نے پیرائے بھابی کو اندر بلوایا۔ وہ اپنے کالے رنگ کے کوٹ میں جو کہ اب کسی حد تک گھسا پٹا نظر آنے لگا تھا، بڑی تمکنت سے مسکراتی ہوئی اندر داخل ہوئیں۔ ہم نے معمول کے خیر مقدمی جملوں کا تبادلہ کیا۔ نجاتی ان کے لیے کرسی لے کر آ گیا۔ بوبی نیازی سوچتا رہا کہ آیا وہ کوئی ایسی حرکت کرے یا نہ کرے کہ وہ اسے کچھ بخشش دینے پر مجبور ہو جائیں لیکن اس نے ارادہ ملتوی کر دیا۔

انہوں نے پیرائے بھابی سے پوچھا کہ کیا انہوں نے اپنا ہوٹل تبدیل کیا ہے۔ انہوں نے اس کا جواب ہنسی میں ٹال دیا......

بے چاری خاتون کافی دیر تک اکیلی بیٹھی انتظار کرتی رہی۔ پھر آخر کار جب وہ کافی دیر تک پرواہ نہ کرنے کا ناٹک کر چکے تو گورنر اور رجسٹرار دونوں کی درخواست اور اصرار کے بعد ملاقات کے لیے آمادہ ہو گئے۔ وہ اپنی بیوی سے ملنے کے لیے نیچے گئے اور یہ کوئی حیرانی کی بات نہیں تھی کہ جیسے ہی دونوں آمنے سامنے آئے، تمام گلے شکوے ختم ہو گئے۔

جس دن پیرائے نے ملاقات کے لیے آنا ہوتا ناظم بہت زیادہ معروف ہوتے۔ ایک شام پہلے ہی وہ اپنا سوٹ استری کر لیتے چارپائی کے نیچے سے اپنے میرون جوتے نکالتے اور انہیں پالش کر کے رکھ دیتے اور پھر علی الصبح وہ حجام کے پاس جاتے، اپنے بال کٹواتے اور رگڑ کر شیو کرواتے۔ اور جب مَیں ابھی بستر میں ہی ہوتا، وہ آتے اور میرے سامنے کھڑے ہو جاتے، صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوئے، معائنے کے لیے تیار۔

"تم کیسے ہو؟ اصل بات یہ ہے کہ مَیں کیسا لگ رہا ہوں؟ کیا مَیں بہت اچھا نظر نہیں آ رہا؟"

"کیا.... بات ہے! آپ تو دوسرے مسٹر ایڈن نظر آ رہے ہیں!"

"اچھا.... بہت خوب، مَیں مسٹر ایڈن بن گیا ہوں۔"

وہ اپنی بھوری مونچھوں کو چباتے ہوئے قہقہہ لگاتے۔

(انتھونی ایڈن 38-1935ء اور 45-1940ء میں انگلینڈ کے وزیر خارجہ تھے اور اپنی خوش لباسی کی وجہ سے مشہور تھے)۔

ہماری جیل میں یہ رواج بن چکا تھا کہ اپنے بچوں سے ملنے کے لیے آنے والے والدین، بیویاں جو اپنے خاوندوں سے ملنے آتیں اور اپنے بھائیوں کو ملنے کے لیے آنے والی بہنیں، اپنے قریبی اور عزیز رشتہ داروں کے ساتھ جیل کے باغ کے ایک کونے میں یا ملاقاتیوں کے کمرے میں جب تک جی چاہتا، بیٹھے رہتے، مل جل کر کھاتے پیتے، گپیں ہانکتے اور جی بھر کر اپنے ارمان نکالتے۔ یہ سب گورنر کی وجہ سے تھا۔ میرا خیال ہے کہ مَیں یہ بات بھی آپ کو بتاتا چلوں کہ اہم مذہبی تہواروں کے مواقع پر وہ اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکتے اور رونے لگتے۔ اس سے آپ کو صاف اندازہ ہو جائے گا کہ وہ کس قسم کے انسان تھے۔ جی ہاں، وہ حقیقت میں رو پڑتے تھے۔ "اس مقدس اور متبرک دن جب ہر کوئی اپنے خاندان اور پیاروں کے ساتھ ہوتا ہے۔" وہ اس محرومی کے بارے میں سوچتے جس کا ہم قیدیوں کو سامنا تھا اور وہ اکثر کہتے، "...... اے میرے پیارے خدا، مجھے توفیق دے کہ مَیں اس کام کے علاوہ کسی اور طور پر اپنی روزی کما سکوں!"

دوسرے قیدیوں کی طرح ناظم بھی گورنر کی رواداری سے بھرپور فائدہ اٹھاتے اور جب

پیرائے بھابی یا ان کی والدہ، ان کی بہن یا بہنوئی ملنے کے لیے آتے تو وہ ان کی پوری دعوت کرتے، ان کی کیسی دعوت ہو سکتی تھی؟ محض وہ چیز جس کا موسم ہوتا اور وہ جیل کی دکان سے مل سکتی، ٹماٹر، مرچیں، بینگن، بھنڈیاں...... ایک یا دو بہترین کھانے جو آپ ان سے بنا سکتے ہیں۔

یہ ایسا ہی مذہبی تہواروں میں سے ایک تہوار تھا، پیرائے بھابی ملاقات کے لیے آئی ہوئی تھیں۔ وہ یہاں صرف ایک دن کے لیے آ رہی تھیں اور شام کو واپس چلے جانا تھا۔ یہ پیسوں کا معاملہ تھا جو کہ پیرائے کے پاس نہیں تھے۔

معمول کے مطابق ناظم صبح سویرے اٹھے اور اپنا بہترین لباس پہن کر تیار ہو گئے۔ وہ راہداری میں آخری سرے تک پہنچنے سے پہلے تیزی کے ساتھ پلٹتے ہوئے اور بے چینی کے ساتھ پائپ کے کش لگاتے، چکر لگا رہے تھے......

کافی دیر بعد اطلاع آئی کہ ان کی بیوی پہنچ چکی ہیں، اور وہ نیچے چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد میں نے کپڑے تبدیل کیے اور پیرائے سے سلام دعا کے لیے نیچے گیا اور پھر انہیں آپس میں تنہا چھوڑ کر واپس آ گیا۔

شام کو وہ واپس چلی گئیں، ناظم اوپر آ گئے۔ وہ بڑے بدحال نظر آ رہے تھے اور یوں دکھائی دے رہے تھے جیسے کافی بوڑھے ہو گئے ہوں۔ انہوں نے اپنا پائپ بستر پر پھینکا اور بے دلی کے ساتھ خیالات میں ڈوبے ہوئے اپنے کپڑے تبدیل کیے۔ انہوں نے اپنا سرخ دھاریوں والا پاجامہ پہن لیا جو کہ بوسیدہ اور پرانا ہو چکا تھا۔ وہ کھڑکی کے ساتھ سر رکھ کر لیٹ گئے اور غروب ہوتے ہوئے سورج پر اپنی نظریں گاڑ دیں، کافی دیر وہ یوں ہی پڑے رہے۔ ''لعنت ہے۔'' انہوں نے ایک ٹھنڈا سانس بھرا، ''چھے سال گزر چکے ہیں!''

پھر اچانک ان کی نیلی آنکھیں چمک اٹھیں، وہ زندگی کی جانب لوٹ آئے۔ ''کیا تمہیں علم ہے کہ میں اس وقت شدت کے ساتھ کیا چاہ رہا ہوں؟ میں استنبول میں اپنے گھر پر ہوتا، وہ گھر جس کی تزئین و آرائش میں نے اپنے ہاتھوں سے کی تھی بالکل اس طرح جیسے میں چاہتا تھا...... جب شام ہو جائے تو میں اپنی بیوی اور بیٹے میمت (Memet) کو اپنے ساتھ لوں۔ ہم ادھر گھومے پھریں، اور پھر کسی یونانی شراب خانے میں جا گھسیں اور جب ہم میاں بیوی آمنے سامنے

بیٹھے راکی کی چسکیاں لے رہے ہوں، میرا پسندیدہ سنیکس کھا رہا ہو جو شراب کے ساتھ کھاتے ہیں!"

پھر وہ بہت زیادہ جذباتی ہو گئے اور شدید حسرت ناک انداز میں کہنے لگے، "اس کے لیے، صرف اتنی سی خوشی کے لیے، بغیر کسی تردد کے میں اپنی باقی ماندہ زندگی سے جتنی بھی رہ گئی ہے، خوشی سے دس سال دینے کو تیار ہوں!"

IX

اُن کی والدہ بھی گاہے بگاہے ان سے ملنے آتی رہتیں تھیں۔ ناظم کی والدہ بہت زیادہ خوب صورت شکل وصورت والی ایک باوقار خاتون تھیں۔ وہ چشمہ لگاتی تھیں اور ان کے شائستہ، پروقار انداز واطوار دیکھنے والے میں احترام اور عزت کے جذبات پیدا کرتے تھے۔

ملاقات کے پہلے روز وہ معمول کی اِدھر اُدھر کی ہلکی پھلکی باتیں کرتے، پھر ناظم انہیں اپنی نظمیں پڑھ کر سناتے۔ وہ اپنے بیٹے کی شاعری بڑی توجہ سے سنتیں، اور اکثر ناظم کے مزاج اور کیفیت کے مطابق بہت زیادہ جذباتی ہو جاتیں۔

وہ ایک اچھی مصورہ بھی تھیں۔ ماں اور بیٹے کے درمیان ہونے والی نجی گفتگو کے بعد ناظم کی شاعری کی باری آتی اور پھر مصوری کا آغاز ہو جاتا۔ وہ اپنے بیٹے کے سامنے بیٹھ جاتیں، اپنے رنگ/پینٹ نکال کر قرینے سے رکھتیں اور سامنے ایزل کھڑا کر لیتیں اور اپنے بیٹے کی پورٹریٹ بنانا شروع کر دیتیں۔

اس دوران جیل کے رہائشی ہر قسم کے لوگ گورنر سے لے کر مفلس ومحتاج قیدیوں تک سب لوگ آتے جاتے رہتے اور ایک بوڑھی خاتون کے پینٹنگ کرنے کے عمل کو بڑے تجسس اور حیرت سے دیکھتے۔ یہ اُن کے لیے ایک غیر معمولی نظارہ ہوتا تھا۔ وہ دوسرے افراد کے ساتھ جو دیکھ رہے ہوتے، اپنے تبصروں اور خیالات کا تبادلہ کرتے۔

وہ ایسا ہی ایک دن تھا۔ ناظم کی والدہ پہنچ چکی تھیں، انہوں نے مکمل سیاہ لباس پہنا ہوا

تھا۔ابتدائی ملاقاتی جملوں کے بعد ناظم نے اپنی نظم "Ülkem Insan Manzaralari" (میرے وطن سے انسانی مناظر) پڑھ کر سنائی، جب وہ اس کا کچھ حصہ پڑھ چکے تو ان کی والدہ واضح طور پر جذباتی نظر آنے لگیں، ان کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے۔ جب شاعری کا مرحلہ اختتام کو پہنچا تو ناظم وہ تصاویر لے آئے جو انہوں نے خود پینٹ کی تھیں۔ یہ جیل کے قیدیوں میں سے مختلف کرداروں کی پورٹریٹس تھیں۔ ماں جو بیٹے کی شاعری سنتے وقت مکمل طور پر مغلوب نظر آ رہی تھی، جب پینٹنگ کا معاملہ آیا تو وہ زیادہ متاثر دکھائی نہیں دیتی تھی۔ وہ اپنے بیٹے کی پورٹریٹس میں نقص نکالتی رہیں۔ مثال کے طور پر انہوں نے جس طرح ناظم نے رنگوں کا استعمال کیا تھا، ان کے باہمی امتزاج پر تنقید کی اور انہوں نے تفصیل سے بیان کیا کہ کچھ مخصوص رنگوں کو دوسرے رنگوں کے ساتھ کس طریقے سے استعمال کرنا چاہیے۔

ناظم نے ان کی تمام باتیں ایسے جوش و جذبے اور خوشی کے ساتھ سنیں جس کا اظہار وہ کوئی نئی چیز سیکھتے وقت کرتے تھے۔ انہوں نے اپنی والدہ کو ہدایات دہرانے کی درخواست کی اور پھر رنگ بنانے والی پلیٹ پر اسے عملی طور پر کر کے دیکھا۔ وہ اس کے نتیجے سے بہت خوش ہوئے۔ پھر ان کی والدہ نے انہیں اپنے سامنے بٹھالیا اور تصویر بنانا شروع کر دی۔

جب ان کی والدہ پینٹنگ کر رہی ہوتیں، وہ پنسل سے ماڈل کا خاکہ بناتیں، لیکن وہ اس کو مزید سنوارنے کے لیے پنسل کا استعمال نہیں کرتی تھیں۔ وہ براہِ راست رنگوں کا استعمال شروع کر دیتیں۔ ناظم پہلے پنسل سے پوری تصویر تیار کر لیتے تھے، لیکن اس دن کے بعد انہوں نے اپنی والدہ کی طرح پنسل کا استعمال ترک کر دیا تھا۔

بہرصورت ناظم کی پورٹریٹ ہر لحظہ تکمیل کی جانب بڑھ رہی تھی، لیکن آپ یہ خیال نہ کر لیں کہ وہ وہاں بے حس و حرکت بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ بار بار اپنی والدہ کے کام پر تبصرہ کرنے کے لیے مداخلت کر رہے تھے اور پھر ان کی والدہ نے انہیں ہلکی سی ڈانٹ پلاتے ہوئے کہا:

"اب، پیارے ناظم! بہت ہو چکا ہے!"

"ٹھیک ہے ماں، معافی چاہتا ہوں، مَیں صرف یہ کہنا چاہتا تھا....."

"تم جو بھی کہنا چاہتے ہو، اپنی تصویروں کے بارے میں کہنا..... اس وقت خاموش

ہو جاؤ!"

اور پھر خوشگوار اور محبت بھرے قہقہوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ تھوڑی دیر بعد وہ تصدیق کے لیے میری جانب گھوتیں، "بیٹا! کیا مَیں نے صحیح نہیں کہا؟"

ناظم اور مَیں ایک دوسرے کی جانب دیکھتے۔

مَیں آہستہ سے جواب دیتا: "آپ بالکل صحیح کہتی ہیں۔"

ناظم قدرے رنجیدہ سے نظر آتے لیکن یہ بات انہیں دوبارہ مداخلت کرنے سے نہ روکتی۔

ان تمام بہت سی ایسی ان تمام مداخلتوں کے درمیان تصویر بتدریج مکمل ہوتی چلی جاتی۔ بعض اوقات ناظم اچھل کر کھڑے ہو جاتے اور اپنے ہاتھوں، بازوؤں اور آنکھوں کے اشاروں سے بعض چیزوں کی وضاحت شروع کر دیتے۔ ان کی والدہ اپنے برش ہاتھوں میں لیے چشمے کے اوپر سے گھورتے ہوئے مجبوری کے عالم میں ان کی باتیں سنتی رہتیں گویا کہ کہنا چاہتی ہوں، "ذرا اسے دیکھو، یہ میری پینٹنگز کو پسند نہیں کرتا۔"

ان کا بیٹا آرٹ کے بارے میں کسی بھی چیز سے متعلق بڑی بے لچک آراء رکھتا تھا خواہ وہ فنکار اس کی کوئی نزدیک ترین اور عزیز ترین ہی ہستی کیوں نہ ہو۔ "میری پیاری ماں، شاید مَیں بہتر طور پر آپ کو سمجھا نہیں سکا۔ میرا مطلب تھا......" اور وہ ایک لمبی وضاحت شروع کر دیتے ان کے ہاتھ، ان کے بازو مسلسل حرکت میں ہوتے...... جہاں تک مجھے یاد ہے، بحث کچھ اس طرح کی ہوتی، ان کا موقف یہ ہوتا کہ ان کی والدہ اپنے موضوعات کا انتخاب، ان اشیاء سے کرتی ہیں جو دلکش طور پر خوب صورت ہوتیں ہیں اور دلوں کو لبھاتی ہیں، اور وہ حسن کی چربہ سازی میں مصروف ہیں۔ لیکن ناظم پینٹنگ میں ایسے موضوع کا انتخاب نہیں چاہتے تھے جو اُس حسن کی نمائندگی کرتا ہو جسے عام طور پر خوب صورت سمجھا جاتا ہے، بلکہ ایسا موضوع جو "بدصورتی" میں پائے جانے والے "حسن" کو اجاگر کرتا ہو، جو اس سماجی ماحول کا عکاس ہو جس میں ہم رہ رہے ہیں۔

"لیکن، ناظم میرے پیارے! مَیں کیا کر سکتی ہوں؟ مجھے حسن پسند ہے، مَیں اس کو نظر انداز نہیں کر سکتی۔"

''پیاری ماں! مَیں شاید ٹھیک طور پر بیان نہیں کر پا رہا، میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ بے شک ایک خوب صورت خاتون کی تصویر خوب صورت ہوتی ہے، لیکن فاطمہ کدین (خانم) کی پورٹریٹ بھی، جو وسطی اناطولیہ میں ملیریا زدہ علاقے میں رہتی ہے، جو محض ہڈیوں کا ڈھانچا ہے اور انتہائی بدصورت ہے بلکہ کراہت انگیز ہے، خوب صورت ہو سکتی ہے!''

وہ اپنے آپ پر مزید قابو نہ رکھ سکے اور تیزی سے ایک پورٹریٹ لانے کے لیے نکل گئے جو وہ سمجھتے تھے کہ وہ جو کہنا چاہتے ہیں اس کی بہتر وضاحت کر سکتی ہے۔ مَیں ان کی والدہ کے پاس اکیلا رہ گیا۔ اپنے چشمے کے اوپر سے دیکھتے ہوئے اور اپنی آواز کو ممکنہ حد تک دھیما رکھتے ہوئے وہ مجھ سے کہنے لگیں، ''یہ لڑکا پاگل ہے، بالکل پاگل...... یہ مکمل طور پر ایک اچھی تصویر ہے...... وہ میری تصاویر پسند کیوں نہیں کرتا؟''

پھر ناظم ایک بگولے کی مانند اندر آئے، ہاتھ میں وہ پورٹریٹس تھامے ہوئے جو انہوں نے پینٹ کی تھیں۔

''میرا مطلب یہ ہے، بجائے محض قدرت کی چربہ سازی کے، کوئی ایسی چیز آپ کی نمائندگی کرتی ہو۔''

وہ بولتے، بولتے اور بولتے ہی چلے گئے۔

ان کی والدہ بڑے تحمل کے ساتھ اپنے چشمے سے بیٹے کو دیکھتے ہوئے اور پینٹ برش ہاتھ میں تھامے سنتی رہیں۔

جب ناظم شاعری سے اکتا جاتے وہ اپنی ساری توانائیاں پینٹنگ میں لگا دیتے۔ کوئی بھی شخص جس کے ہاتھ آدھ میٹر کے قریب کینوس کا کپڑا اور سفیدے (سفید لیڈ یا سیسہ) کی تھوڑی سی مقدار اور گوند لگ جاتی، وہ آتا اور ان کے سامنے بیٹھ جاتا۔ سب لوگ آتے، جن میں ظاہر ہے اونٹ بھی شامل تھا، اور پھر زمیندار جس بھی گاؤں سے اس کا تعلق تھا، آذربائیجان سے آنے والا نوجوان ایک یا دو مفلس اور نادار قیدی اور بہت سے مزید لوگ۔

وہ سب سے پہلے اپنا ایزل کھڑا کرتے اور پھر وہ بکس کھولتے جو انہوں نے خاص طور پر رنگ رکھنے کے لیے بنایا ہوا تھا اور اپنے سارے رنگ بستر پر بکھیر دیتے۔ کسے پرواہ تھی اگر

رنگ کی کچھ ٹیوبوں سے رنگ نکل کر گر جاتا اور بستر کی چادر اور کمبل کو داغ دار کر دیتا۔ تیاری کرتے ہوئے وہ مسلسل بڑے اشتیاق کے ساتھ سیٹی بجا رہے ہوتے...... پھر وہ بڑے نزدیک سے اپنے ماڈل کے چہرے کا مشاہدہ کرنا شروع کرتے۔ وہ اپنی آنکھیں سکیڑ کر دیکھتے، اپنی آنکھیں پوری طرح کھول کر دیکھتے۔ وہ اپنے ماڈل کے چہرے کے نزدیک آتے، پھر وہ پیچھے ہٹ جاتے، دوبارہ نزدیک آتے، پھر دوبارہ پیچھے ہٹ جاتے، اپنی آنکھوں کو ہاتھ سے ڈھانپتے ہوئے، ایک آنکھ کو بھینچ کر بند کرتے ہوئے جیسے کہ وہ کسی دور دراز کے مقام کو دیکھ رہے ہیں۔

''ٹھیک ہے، اس کے چہرے کے گرد کمال کے رنگ بہ رہے ہیں۔''

وہ اپنا پائپ سلگاتے، چند کش لگاتے اور کام شروع کر دیتے۔ جب وہ کینوس پر ایک خاکہ تیار کر لیتے تو پھر وہ انتہائی انہماک سے اپنے کام میں جت جاتے اور ماڈل کے چہرے کے تاثر کو مکمل طور پر مقید کر لینے کی کوشش کرتے تاکہ تصویر میں جذبات کی گہرائی بھری جا سکے۔ اس دوران وہ اکثر اپنا پائپ کہیں پھینک دیتے۔ سیٹی کی آواز بتدریج ہلکی سے ہلکی ہوتی چلی جاتی اور پھر کسی مقام پر پہنچ کر یہ بالکل بند ہو جاتی۔ یہ وہ لمحہ ہوتا تھا جب وہ ماڈل کے ''نفسیاتی تاثر'' کو مقید کر رہے ہوتے۔ اگر وہ اپنے کیے پر مطمئن ہو جاتے تو وہ چلا اٹھتے، ''بالکل ٹھیک، ہم کامیاب ہو گئے ہیں، میرے دوست، ہم کامیاب رہے ہیں۔''

پھر وہ اپنا پائپ تلاش کرتے لیکن وہ انہیں نہ ملتا۔ بعض اوقات وہ مجھے آواز دیتے ''ادھر آؤ! آؤ اور ذرا ایک نظر ڈالو۔'' وہ کہتے، ''دیکھو بعض مائیں کیسے شیروں کو جنم دیتی ہیں۔''

''آپ شیر ہیں؟''

''پورا، پورا، مکمل...... کیا تم ایسا نہیں سمجھتے؟ تم میرے شیر ہونے کے رتبے سے کیوں انکاری ہو؟''

''بالکل نہیں! آپ اس کے پورے پورے مستحق ہیں۔''

جہاں میں بیٹھا ہوتا وہاں سے اٹھ کر ''نفسیاتی تاثر'' کو دیکھنے کے لیے آگے آتا۔

''اس طرف سے دیکھو۔'' وہ کہتے، ''یہاں سے، اس طرف سے۔ یہ کیسا نظر آ رہا ہے؟''

وہ اپنے آپ پر اتنے ہی خوش ہوتے جتنا ایک زوردار شاعری کا کوئی قطعہ لکھنے پر ہوتے۔

''اوہ خدایا! تم میری کبھی تعریف نہیں کرتے! کیا میں اچھا مصور نہیں ہوں؟''

پھر وہ کہتے، ''اگر تم تھوڑی سی چائے بنالو تو، اسے میرے کھاتے میں لکھ لینا۔ اگر ہم اس عارضی دنیا میں چند خوشی کے لمحات بسر کرلیں تو......'' وہ اکثر یوں ہی کہتے تھے، ان کی آواز میں مسرت و انبساط اور ایک عزم جھلک رہا ہوتا۔ وہ دنیا اور خاص طور پر اپنے آپ سے مطمئن تھے، بالکل ایک بچے کی طرح بے فکر۔

انہوں نے چند ایک میری پورٹریٹس بھی پینٹ کی تھیں۔ اگر ان کے بس میں ہوتا تو وہ مزید بھی پینٹ کرتے۔ لیکن میرے لیے آنکھیں ایک نقطے ہی پر مرکوز رکھتے ہوئے، ان کی ختم نہ ہونے والی سیٹی کی مسلسل موسیقی کو سنتے ہوئے گھنٹوں بے حس و حرکت بیٹھے رہنا بہت تکلیف دہ عمل ہوتا تھا۔

ان کے ماڈل، شعوری یا لاشعوری طور پر، انہیں بہت سا قیمتی مواد مہیا کرتے تھے، انہوں نے یہ مواد Ülkem Insan Manzaralari میں جا بجا استعمال کیا۔ اس کی ایک مثال یایلر گاؤں سے تعلق رکھنے والا وہ خاص شخص تھا جس کا نام ابراہیم تھا۔ وہ ناظم، ارطغرل اور امین بے کا ایک اچھا دوست تھا، وہ میرا بھی دوست تھا۔ اسے دیکھ کر بھیڑیے کی یاد آتی تھی۔ خم دار ناک، روشن چھوٹی چھوٹی زرد آنکھیں اور سنجیدہ طور طریق کا ایک زندہ دل انسان تھا۔ وہ بے انتہا صبر و استقامت کا مالک تھا اور ناظم کے ٹوٹے پھوٹے ایزل کے سامنے گھنٹوں لگاتار بیٹھا رہتا تھا۔ بعض اوقات وہ صبح سے لے کر دوپہر تک اور بعض اوقات دوپہر سے لے کر شام تک ایک ہی انداز میں بے حس و حرکت بیٹھا رہتا۔

وہ بہت کم باتیں کرتا، لیکن جو بات بھی کرتا وہ وزن رکھتی تھی اور جب بولتا تو آپ پورے انہماک سے سنتے چلے جاتے۔ ہم کافی عرصہ سے دوست تھے اور میں نے اسے کبھی ایسی بات کرتے نہیں سنا تھا جو برمحل نہ ہو۔ وہ بڑا شوخ اور زبردست حس مزاح رکھنے والا شخص تھا اور چہرے پر بڑی شوخ سی مسکراہٹ لیے آپ پر طنز و تنقید کے تیکھے تیر چلا دیتا۔ وہ ناظم کی نظموں میں

"یا یالرگاؤں کے یعقوب" کے کردار میں نظر آتا ہے۔ Ülkem İnsan Manzaraları میں اسے کس نام سے پکارا گیا ہے، مجھے اس وقت ٹھیک طور پر یہ یاد نہیں آ رہا۔ بہ ظاہر وہ سلیمیہ بیرکس میں رہائش پذیر ایک سپاہی تھا۔ یہاں عالمی جنگ کے دوران وہ بیرکوں کے گرد باغیچوں میں اپنے قدموں کے نیچے جوئیں مسلتا ہوا گھومتا رہتا تھا، اور اس نے میمت کو ملنے والی خوراک کے راشن کے بدلے وہ سرخ کمر بند حاصل کیا تھا جو وہ اب باندھے ہوتا تھا۔ یہ شخص یا یالرگاؤں کا ابراہیم فوجیوں کے بارے خاص طور پر اتحاد و ترقی کمیٹی کے تحت خدمات انجام دینے والے فوجیوں کے بے شمار دلچسپ واقعات اور حکایات کا بہت بڑا ذخیرہ تھا، اور اس حوالے سے ناظم کے لیے مواد کا ایک بہت اہم ذریعہ تھا۔

ناظم، ابراہیم سے یہ واقعات سنتے اور نوٹس تیار کرتے اور بعد میں ان پر کام کر کے ابراہیم کو پڑھ کر سناتے۔ ایک مرتبہ ابراہیم، ناظم کو یہ پڑھتے ہوئے سن رہا تھا اور مجھے اس کا ردعمل آج تک یاد ہے۔ "استاد، جو کچھ آپ نے لکھا ہے وہ اس کے نزدیک ترین ہے جو کچھ حقیقت میں ہوا تھا، بہ نسبت اس کے جو مَیں نے آپ کو سنایا تھا۔"

پھر چورباجی میمت تھا (میمت یخنی پکانے والا: ترکی میں "میمت" کا لفظ ترک فوجی کے لیے بولا جاتا ہے، جب کہ برطانوی فوجی کو "ٹومی" کہا جاتا تھا)۔ کوریا میں میمت ایک لمبے عرصے تک چین کے شفاخانے میں باورچی کے طور پر کام کرتا رہا تھا۔ اور وہ بھی ایک 'میمت' تھا اتنا ہی باوقار، سنجیدہ اور صابر تھا جتنا کہ یا یالرگاؤں کا ابراہیم تھا۔ مَیں ان دو میمتوں کے ساتھ جیل کے ہسپتال کے باورچی خانے میں بھورے سٹولوں پر بیٹھ کر چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے ان کی سنجیدہ گفتگو کو بڑی دلچسپی کے ساتھ سنا کرتا تھا جس میں خاموشی کے لیے بامعنی وقفے بھی آتے رہتے تھے۔ چورباجی بھی ناظم کو قیمتی مواد فراہم کرتا رہتا تھا۔ خاص طور پر قومی جدوجہد کے دوران کوجیلی (Kocaeli) کے علاقے میں پیش آنے والے واقعات کی تفصیلات بہت اہم تھیں۔

ایک اور کردار جو اُن دنوں سے میرا واقف تھا ایک بوڑھا شخص تھا جس نے سلطان رشاد کا تمغہ لگا رکھا تھا۔ وہ ستر سال سے اوپر کا ایک بوڑھا آدمی تھا جو اپنی ترشی ہوئی سفید داڑھی کے ساتھ ایک کمزور اور تنکے کی مانند ہلکا پھلکا انسان تھا۔ وہ بلقان کے باشندوں جیسا لباس پہنتا تھا،

وہ بلقان جنگ کی وجہ سے ترکی آیا تھا اور اپنے داماد کو "غیرت کے نام پر قتل کرنے" کے جرم میں جیل میں تھا۔ وہ روسی اور بلغاریہ کے لوگوں کے خلاف شدید نفرت رکھتا تھا، اور پہلے سیکشن کی بیچ دار راہداری کے نیم اندھیری بیس میٹر لمبی کنکریٹ کی پگڈنڈی پر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے چہل قدمی کرتا رہتا تھا۔

وہ شاید ناظم کے تمام دوستوں میں سے سب سے زیادہ محترم تھا۔ ناظم اس کی عزتِ نفس، خودداری اور باوجود غریب ہونے کے اور دن بھر میں اکثر ایک سے زیادہ وقت کھانا حاصل نہ کر سکنے کے باوجود کسی پر بوجھ نہ بننے کی اس کی کوشش اور کسی سے بھی کوئی چیز نہ مانگنے کے اس کے عزم کی وجہ سے اس کی بہت عزت کرتے تھے۔

ناظم اکثر اس بوڑھے آدمی کے وارڈ میں چلے جاتے اور اس کے بستر کے کنارے پر بیٹھ جاتے جس پر اگرچہ جگہ جگہ پیوند لگے ہوتے تھے لیکن وہ ہمیشہ بے داغ طور پر صاف ہوتا اور وہ اس کی نصیحتوں کو بڑے غور سے سنتے۔ جب بوڑھا آدمی بات کر رہا ہوتا تو اس کی کرخت نگاہ ایک تکریم کا جذبہ بیدار کرتی اور اس کی حرکات و سکنات نپی تلی ہوتیں۔ ناظم نے کبھی بھی کسی تنقیدی جواب یا ردِعمل کا اظہار نہیں کیا تھا۔ وہ رازدارانہ طور پر نوٹس لیتے رہتے اور وقتاً فوقتاً وہ بوڑھے آدمی کی یادداشت کو کریدنے کی کوشش کرتے اور اسے مزید باتیں یاد دلانے میں کامیاب ہو جاتے۔

مجھے یاد نہیں کہ اس بوڑھے آدمی کو Ülkem İnsan Manzaraları میں کیا نام دیا گیا لیکن جو کچھ وہ کہتا تھا، درج ذیل مصرعوں میں بیان کیا گیا ہے:

ایک دھات ہے جو کہ پیتل ہے
ایک آدمی ہے جو ولد الحرام ہے
لیکن یہاں کچھ اچھے لوگ بھی ہیں!

پھر کوئی شخص ایک خواب دیکھتا۔ خواب میں کوے گوبر پر اترتے ہیں اور پھر اڑ جاتے۔ Ülkem İnsan Manzaraları میں یہ تمام بند ان واقعات پر مشتمل ہیں جو ناظم نے بلقان کے اس بوڑھے شخص کے ساتھ اپنی دوستی میں حاصل کیے۔

بوڑھے آدمی کا اپنی بوڑھی بیوی کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا، وہ بھی اُس کی طرح ستر سال سے زیادہ عمر کی تھی اور کبڑی تھی۔ مہینے میں ایک مرتبہ یا ہر دوسرے مہینے وہ ایک چھوٹا سا بیگ اٹھائے جیل میں اسے ملنے کے لیے آیا کرتی تھی۔ بوڑھا آدمی اسے اپنی جوانی والے اکھڑپن اور دم خم کے ساتھ ملتا، اس کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوتے۔ ایک برتری کے احساس کے ساتھ جس میں اس نے کبھی کمی نہیں آنے دی تھی، وہ اس کے آگے آگے چلتا ہوا اسے جیل کے باغ کے آخری کونے میں ایک سایہ دار جگہ لے جاتا۔ وہ دونوں وہاں تنہائی میں گھنٹوں بیٹھے رہتے۔

پھر ایک صبح ہم نے سنا کہ بلقان کا بوڑھا آدمی رات سونے کے بعد دوبارہ نہیں اُٹھا۔ وہ اپنی موت میں ایسا پرسکون نظر آ رہا تھا جیسے کہ وہ بڑی میٹھی اور آرام دہ نیند سویا ہوا ہو اور ابھی تک جاگا نہ ہو۔ اس کا چہرہ بہت زیادہ پرسکون تھا...... صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ بغیر کسی ہلچل یا تکلیف کے موت کی وادی میں اُتر گیا تھا۔

جیل کے معمول کے شور شرابے اور ہنگامے میں، بلقان کے اس بوڑھے شخص کے مردہ جسم کو، اس کی چھاتی پر سرخ اور سبز ربن سے لٹکتے ہوئے میڈل کے ساتھ لاش اٹھانے والے مخصوص سٹریچر پر ڈال کر آرام کے ساتھ جنازہ گاڑی میں رکھ دیا گیا۔ ناظم بھی ان افراد میں شامل تھے جنہوں نے سٹریچر کو کندھا دیا تھا۔ مَیں بھی وہاں موجود تھا۔ بوڑھا آدمی یوں نظر آ رہا تھا جیسے سویا ہوا ہو۔ وہ اب بھی اپنے صاف جھریوں والے چہرے کے ماتھے پر چڑھی تیوری کے ساتھ ایک متکبر شخصیت کا مالک نظر آ رہا تھا۔ یوں نظر آتا تھا کہ وہ اپنی رعونت اپنے ساتھ قبر میں لے کر جا رہا ہے۔ اس کا میڈل، اس کی بند آنکھیں، اس کا جھریوں والا چہرہ، اس کی بوسیدہ سرخ دھاریوں والی قمیص، قمیص کے گریبان پر سامنے پٹی پر اور گردن کے گرد لگے پتھر کے بٹن، ہر چیز اور ہر چیز زندہ تھی۔ صرف اس کے پاؤں...... وہ زرد تھے، بہت زیادہ زرد۔ صرف اس کے پاؤں مردہ تھے۔

کیا کوئی ایسا شخص ہوگا جس نے Ülkem İnsan Manzaralar ı کے لیے مواد مہیا نہ کیا ہو؟ یا یالرگاؤں کا ابراہیم، چورباجی مہمت، لاز ایوب آغا، کیپٹن الیاس، بہت سے بلقان کے مہاجر، آذری شکرو بے، غالب اُستا جیسے تمام لوگ۔

غالب اُستا...... جیل سے نکلنے کے بعد بھی میں اس سے ملا، ہم دوست بن گئے تھے، اور میں اس کا بہت زیادہ مداح تھا۔ لیکن اب وہ یہ غالب اُستا نہیں رہا تھا۔ وہ بالکل ایک نیا غالب اُستا تھا، جو پچاس کو پہنچنے والا تھا، لیکن جوان رہنے کا پختہ عزم کیے ہوئے تھا۔ وہ سوچتا ہے، "...... اگر میرے پاس ٹریکٹر ہوتا، میں اس سے کھیت میں ہل چلاتا، پھر میں اسے بہت اچھی قیمت پر بیچ دیتا۔ اور جو رقم مجھے ملتی اس سے اپنے بچوں کو سکول بھیجتا۔ میرے برعکس وہ اپنی تعلیم مکمل کر لیتے اور انجینئر بن جاتے...... اور جو کچھ میں نے حاصل کیا ہے اس سے بازی لے جاتے۔" اب وہ ایک جوان دادا ہے، جس نے کبھی دھیان نہیں دیا کہ وہ کب مرنے جا رہا ہے۔

حیدر پاشا ریلوے سٹیشن پر

1941ء کا موسم بہار

اس جگہ سہ پہر کے تین بجے

سیڑھیوں پر، دھوپ

تھکن،

اضمحلال

ایک آدمی

سیڑھیوں پر کھڑا ہے

مختلف اشیاء کے بارے میں سوچتے ہوئے

وہ دبلا پتلا ہے

بزدل

لمبی نوک دار ناک والا،

اس کے رخسار چیچک کے داغوں سے بھرے ہوئے ہیں،

سیڑھیوں پر کھڑا آدمی ہے

غالب اُستا،

جو عجیب و غریب باتیں سوچنے کے لیے مشہور ہے۔

یوں Ülkem İnsan Manzaraları کا آغاز اس طرح سے ہوتا ہے۔

شاعری کو پرکھنے کے معاملے میں ناظم کے لیے سب سے بڑا معیار ''عوام'' تھے۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے، ''ایک مقبول فن کار کے لیے سب سے پہلی اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ اُسے عوام سمجھ سکیں۔ ضروری ہے کہ وہ عوامی فن کار ہو۔'' اس بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے انہوں نے Ülkem İnsan Manzaraları بہت مرتبہ جیل میں ہر طبقے کے لوگوں کو پڑھ کر سنائی۔ انہوں نے وہ حصے حذف کر دیئے جن کے بارے میں انہیں احساس ہوتا کہ وہ آسانی سے سمجھ میں نہیں آ رہے، اور انہیں سادہ اور موثر انداز میں دوبارہ لکھا۔

جب ناظم اپنی نظمیں پڑھ رہے ہوتے، مَیں نے اکثر محسوس کیا کہ لوگ حقیقت میں متاثر نظر آ رہے ہوتے، کچھ رونے لگتے اور کچھ آہیں بھرنے لگتے۔ بہت سے لوگ ایسے بھی ہوتے جن کو نظمیں سننے کے بعد خود اپنے واقعات اور محرکات یاد آنے لگتے۔

''جی ہاں! بالکل صحیح ہے ناظم بے، انہوں نے اسی طرح سے ازمت میں علی کمال کے ٹکڑے کر دیئے تھے اور ہم لگاتار نعرے لگاتے رہے، ''آرتن کمال'' ۔'' (علی کمال، اتحاد و ترقی کمیٹی کے سخت مخالف ایک صحافی تھے۔ جب قوم پرست ترک کمانڈروں نے انہیں ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے لیے ازمت میں 1922ء میں ہجوم کے حوالے کیا تو ہجوم اس دوران ''آرتن کمال'' کے نعرے لگا رہا تھا۔ آرتن ایک عام آرمینی نام ہے، یعنی ان نعروں سے مراد یہ تھی کہ علی کمال کی ہمدردیاں ترکوں کی بجائے آرمینیوں کے ساتھ تھیں)۔

بعض اوقات ناظم ایک واحد لفظ کے لیے بہت زیادہ محتاط ہو جاتے۔ وہ بہت سی کتابوں میں دیکھتے اور لفظ کی اصلیت کے بارے میں انتہائی قابل اعتماد معلومات حاصل کرنے کے لیے وہ جیل کی راہداریوں میں بگولے کی مانند بھاگتے پھرتے اور جیل کے ایک حصے سے دوسرے حصے میں جانے کے لیے وہ مقفل دروازوں کو کھلوانے کے لیے آدھا آدھا گھنٹہ یا پورا پورا گھنٹہ انتظار کی بھی پرواہ نہ کرتے۔

وہ معلومات حاصل کرنے کے لیے ہر کسی سے سوال کرتے۔ وہ قیدیوں میں سے عمر رسیدہ لوگوں کو تلاش کرتے جن کے بارے میں امکان ہوتا کہ وہ کچھ نہ کچھ جانتے ہوں گے اور

ان کو بیتے ہوئے پرانے دنوں میں لے جانے کے لیے ان کے ساتھ لمبی لمبی باتیں کرتے۔ آخر کار وہ اپنی تلاش میں کامیاب ہو جاتے اور جواب حاصل کر لیتے تو فاتحانہ انداز میں واپس اپنے وارڈ میں آ جاتے۔

مجھے ستمبر 1943ء کے آخر میں رہائی ملنے والی تھی اور میری رہائی کا دن قریب آ رہا تھا۔ اور ایک دن جب مَیں کام سے واپس آیا تو مَیں نے ایک دیہاتی نوجوان کو اپنے کمرے میں دیکھا۔ ناظم اسے کوئی بات سمجھا رہے تھے، لڑکے نے اپنی جیب سے ایک نوٹ بک نکالی اور جو کچھ ناظم کہہ رہے تھے اس پر لکھنا شروع کر دیا۔ ''برش، سائز 1، 2 اور 3، سفیدہ، گوند......''

''ان کے علاوہ کوئی چیز؟''

''فی الحال یہی کچھ۔''

لڑکے نے نوٹ بک واپس اپنی جیب میں رکھ لی۔ وہ چہرے مہرے سے ایک ذہین نوجوان نظر آ رہا تھا۔

''ٹھیک ہے استاد۔'' اس نے کہا، ''کل ملاقات کا دن ہے۔ میرے والد گاؤں سے مجھے ملنے کے لیے آئیں گے، مَیں انہیں کہوں گا کہ مجھے یہ چیزیں لا دیں۔''

جب وہ نوجوان لڑکا چلا گیا تو ناظم نے مجھے اس کی کہانی سنائی۔ زمین کے ایک جھگڑے پر اور کسی حد تک اپنے والد سے شہ پا کر اس نے اپنی ساتھ والی زمین کے مالک کو قتل کر دیا تھا۔ اسے پندرہ سال قید کی سزا ہوئی تھی۔ چار خانوں کے طریقے کو استعمال کرتے ہوئے وہ بہت سے لوگوں کی کوئلے سے بڑے سائز میں تصاویر بنا چکا تھا۔ وہ ناظم کے پاس آیا اور درخواست کی، ''اگر مَیں آپ کا شاگرد بن جاؤں تو کیا آپ مجھے روغنی رنگوں سے تصویریں بنانا سکھا دیں گے۔'' ان میں معاہدہ طے پا گیا تھا اور وہ اگلے چند روز میں یہ کام شروع کرنے والے تھے۔

ناظم نے کہا، ''جیسا کہ تم دیکھ سکتے ہو یہ ایک صحت مند نوجوان ہے۔ یہ چرس یا افیون کا استعمال نہیں کرتا، نہ ہی خنجر زنی یا جوئے میں دلچسپی رکھتا ہے۔''

وہ لڑکا ہر صبح آ جاتا اور ناظم کے قریب بیٹھ جاتا جب وہ پینٹنگ کر رہے ہوتے۔ وہ ان

کے برش دھوتا، ٹیوبوں میں سے رنگ نکال نکال کر رنگوں والی تختی پر ڈالتا اور سفیدے اور گوند سے کینوس تیار کرتا، اور پھر اپنی بڑی بڑی آنکھیں ناظم کے برش پر مرتکز کرتے ہوئے بڑے صبر اور سکون کے ساتھ تب تک دیکھتا رہتا جب تک ناظم پینٹ کرتے رہتے۔

دن یوں ہی گزرتے چلے گئے۔ میں نہیں جانتا تھا کہ وہ مل کر کیسے کام کرتے تھے، کیوں کہ میں ہر صبح باہر کام پر چلا جاتا تھا۔ لیکن ناظم مجھے اس لڑکے کی "حقیقتاً اعلیٰ صلاحیتوں" کے بارے میں بتاتے رہتے جن کا وہ مالک تھا۔

آخر کار 25 ستمبر کا دن آ گیا۔ اگلے روز میری سزا مکمل ہو جانی تھی......اور مجھے رہائی مل جانا تھی۔ لیکن اس سے پہلے میں آپ کو خرگوش اور سٹرابیری کے بارے میں بتانا چاہتا ہوں، ان دو واقعات سے مجھے ناظم کے بارے میں بہت کچھ جاننے کا موقع ملا تھا۔

X

ہم شہر کے ایک بیرونی مضافاتی علاقے میں سڑک کی تعمیر میں مزدوروں کا کام کر رہے تھے۔ سہ پہر گزرے ایک چھوٹا بچہ ایک خرگوش کے بچے کے ساتھ وہاں آیا جو کہ محض ایک روئی کے گالے کی طرح تھا اور اس کی گلابی شربتی رنگ کی آنکھیں تھیں۔ لڑکا، خرگوش کا یہ بچہ فروخت کرنا چاہتا تھا۔ ہر کوئی جو وہاں موجود تھا خرگوش کے اس بچے کے ساتھ کھیلتا رہا لیکن کسی نے اسے خریدنے کی پیشکش نہ کی۔ مجھے ناظم کا خیال آیا اور مَیں نے اس سے سودے بازی شروع کر دی۔ ہم 50 کوزش پر متفق ہو گئے۔ مَیں نے رقم ادا کر دی اور خرگوش خرید لیا۔

جب مَیں جیل واپس پہنچا، ناظم ریڈیو کے پاس بیٹھے تھے۔ وہ اسی میز کے کنارے پر بیٹھے ہوئے تھے جہاں ریڈیو رکھا ہوا تھا، اُن کا پائپ ان کے منہ میں تھا۔ ان کے پاس اونٹ اپنی چھڑی پر جھکا کھڑا تھا۔

خرگوش کے بچے کو ہاتھ میں لیے مَیں ناظم کے بالکل نزدیک چلا آیا۔ وہ ریڈیو سننے میں منہمک تھے اور شروع میں انہوں نے کسی چیز پر دھیان نہ دیا۔ لیکن جب ان کی نظر خرگوش کے بچے پر پڑی تو وہ ریڈیو کو بھول گئے۔ انہوں نے جست لگائی اور بچے کو میرے ہاتھ سے تقریباً چھین کر اچک لیا!

انہوں نے کسی مشین گن کی طرح خرگوش کے بارے میں مجھ پر سوال داغنے شروع کر دیئے۔ اس دوران وہ خرگوش کو چوم رہے تھے، سہلا رہے تھے اور اسے اپنی قمیص کے اندر ڈال

اور پھر دوبارہ باہر نکال رہے تھے۔

''کیا تم سنجیدہ ہو؟ کیا تم حقیقت میں یہ میرے لیے لائے ہو؟ تم نے یہ میرے لیے خریدا ہے؟ تم نے کتنی رقم ادا کی ہے؟ تم نے یہ کہاں سے خریدا ہے؟'' اور اس دوران سارا وقت وہ اسے چومتے اور سہلاتے رہے۔

''تم نے واقعتاً یہ میرے لیے خریدا ہے؟ تم نے پچاس کوزش ادا کیے؟ اگر میں تمہیں پچاس کوزش دوں تو یہ غیر اخلاقی بات ہوگی۔ لہٰذا اس معاملے میں مجھے معاف کر دینا...... تمہارا بہت شکریہ۔ یہ پوری دنیا میں سب سے زیادہ پُرمسرت تحفہ ہے......''

وہ اپنی کھڑاؤں کے ساتھ ایڈمن بلاک کی کنکریٹ کی پگڈنڈی پر آگے پیچھے چلنا شروع ہو گئے۔ پھر وہ اچانک تیزی کے ساتھ چیف وارڈر کے دفتر میں گھس گئے اور کہا، ''دیکھو چیف اِدھر دیکھو، میرے خرگوش کو دیکھو۔''

چیف وارڈر کے دفتر سے تیزی سے نکلتے ہوئے وہ اسی پھرتی سے رجسٹری میں گھس گئے۔ وہاں کام کرنے والے اس وقت عدالت سے آنے والے نئے قیدیوں اور حوالاتیوں کے اندراج میں مصروف تھے۔

''سلمان بے، میرے خرگوش کو دیکھو! تمہارا کیا خیال ہے؟ اور اس کی آنکھیں؟ کیا خوب ہیں۔ سلیمان بے، سلیمان بے، اِدھر دیکھو......''

''بہت خوب! استاد، مَیں نے اسے دیکھ لیا ہے، اللہ مبارک کرے......''

''مسٹر کلرک، اس کے گل مچھے دیکھو۔ سنو، یہ خرگوش تمہاری فائلوں سے زیادہ اہم ہے، لیکن تم میرے خرگوش میں کسی دلچسپی کا اظہار نہیں کر رہے۔''

وہ رجسٹری سے نکلے اور نیچے سیڑھیاں اتر کر ورکشاپ میں چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد وہ تیزی سے اوپر آئے۔

''ان سب نے میرے خرگوش کو بہت پسند کیا ہے۔ مَیں تمہارا شکریہ کیسے ادا کروں! اسے خرید لینا واقعی بڑی دانش مندی کا ثبوت ہے......''

''اچھا، ایسی بات ہے!''

''ہاں، ہاں، کیوں نہیں، بالکل......لیکن میرے خرگوش کے گل مچھے......''

''اس معاملے میں مَیں اپنی دانش مندی کی شیخی بگھار سکتا ہوں؟''

''تم ایسا کر سکتے ہو، یقینی طور پر تم یہ کر سکتے ہو......لیکن ذرا اس کے دانت تو دیکھو بھائی......! کیا تم جانتے ہو کہ اس کا اوپر والا ہونٹ کٹا کیوں ہوتا ہے؟''

''نہیں......''

''کیوں نہیں؟ تم کیوں نہیں جانتے؟ کیا تم نے زوالوجی نہیں پڑھی؟''

''مَیں نے پڑھی ہے، لیکن میں بھول گیا ہوں......''

''مَیں تمہارے جیسے ذہین آدمی سے یہ توقع نہیں رکھتا تھا......اور تمہیں معلوم ہے؟ اس بات کا علم نہ ہونا میرے خرگوش کی توہین ہے......''

''اچھا تو یہ بات ہے؟ پھر ہمیں بتائیں کہ یہ کیوں کٹا ہوتا ہے؟''

''خرگوشوں کو جانوروں کے طور پر کیا کہتے ہیں۔ ایک ''نوع'' کے طور پر یہ نہیں بلکہ مجموعی طور پر انہیں کیا کہا جاتا ہے؟''

''کادیمہ'' شاید؟ اود بلاؤ بھی اسی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں......''

''تم تو بہت کچھ جانتے ہو......کیا کہا تھا؟ کادیمہ (Kaadima)! اس کا کیا مطلب ہے؟ کترنیے؟''

''ہم اوپر والے ہونٹ کے کٹے ہونے کی اصل بات کو کہیں بھول نہ جائیں! ہونٹ کٹے ہونے کی اصل وجہ کیا ہے؟''

''کیا تم واقعی ہی نہیں جانتے؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے، جب کہ تم لفظ ''کادیمہ'' کو جانتے ہو......''

''ٹھیک ہے، مَیں نہیں جانتا، اور مَیں جاننا چاہتا ہوں......''

''تم مذاق تو نہیں کر رہے......جو شخص ''کادیمہ'' جانتا ہے......''

''مَیں بالکل نہیں جانتا......''

''اچھا تو......تم واقعی نہیں جانتے؟''

"نہیں مَیں وہ نہیں جانتا جو آپ جانتے ہیں اور آپ ہی ہمیں بتائیں گے۔"

"چلو ٹھیک ہے، کیا تم حقیقت میں سمجھتے ہو کہ مَیں جانتا ہوں؟......"

"ہوں!"

انہوں نے قہقہہ لگایا اور اپنی مونچھیں چبائیں...... اور پھر کچھ دیر بعد تیزی سے جیل کے ہسپتال کی جانب نکل گئے...... تھوڑی دیر بعد ہمیں ان کی کھڑاؤں کی آواز دوبارہ سنائی دی۔

"تم جانتے ہو، تم مجھے اس فانی دنیا میں اس سے زیادہ خوش نہیں کر سکتے......"

وہ ایک دائرے میں گھومتے ہوئے اپنے خرگوش کو چوم رہے تھے......

"اس کی آنکھیں، ذرا اس کی آنکھیں تو دیکھو۔"

"............"

"اوہ! اس کے گل مچھے دیکھو، دیکھو یہ کیسے کانپ رہے ہیں!"

"............"

"یہ ضرور اس وقت بھوک محسوس کر رہا ہوگا۔"

"............"

وہ چیف وارڈر سے ملنے کے لیے دوبارہ باہر بھاگ گئے۔

"چیف، چیف، میرے محترم چیف، اگر آپ بوبی کو ذرا اجازت دیں تو جا کر تھوڑا سا دُودھ لے آئے......"

"............"

"چیف، کیا مجھے اسے کھلانے کے لیے کچھ تازہ پھلیاں مل سکتی ہیں؟"

"............"

"دیکھو چیف، ذرا ادھر دیکھو، یہ کانپ رہا ہے۔ مَیں بتاؤں یہ اس لیے نہیں کانپ رہا کیونکہ یہ ڈرا ہوا ہے بلکہ یہ ڈرا ہوا ہے کیوں کہ یہ کانپ رہا ہے۔"

"............"

پھر وہ چوب کاری کی ورکشاپ میں چلے گئے...... بڑھئیوں سے التجا کرتے ہوئے،

ان کی خوشامد کرتے ہوئے اور چھیڑ خانی کرتے ہوئے۔ وہ سب حرکت میں آ گئے اور چند ہی ثانیوں میں خرگوش کے لیے ڈبہ تیار ہو گیا۔

میں اپنی کوٹھڑی میں تھا جب وہ ڈبے کے ساتھ اندر آئے اور اسے ایک کونے میں رکھ دیا۔ انہوں نے کسی طرح سے تھوڑا سا دودھ حاصل کر لیا تھا اور انہوں نے اسے ہمارے کھانے کی پلیٹوں میں سے ایک میں انڈیل دیا۔ انہوں نے ایک دوسری پلیٹ میں پانی ڈال دیا اور اس کے ساتھ کچھ تازہ پھلیاں بکھیر دیں۔ لیکن یہ سب رائیگاں گیا، خرگوش کی شربتی گلابی آنکھوں میں غم اور اُداسی صاف نظر آ رہی تھی...... اس نے ایک ہی جگہ پر نظریں جما رکھی تھیں، خود بخود کانپتے ہوئے اس کے گل مچھے پھڑک رہے تھے۔

ناظم کولہوں پر ہاتھ ٹکائے کھڑے تھے، وہ کافی دیر تک جانور کے رویے کو دیکھتے رہے۔ پھر وہ نیچے جھکے اور دودھ کی پلیٹ اس کی جانب سرکائی، خرگوش نے چھلانگ لگائی گویا کہ اسے کچوکہ لگا ہو اور دودھ کی جانب پشت کر کے بیٹھ گیا۔ اس مرتبہ ناظم نے پھلیاں آگے سرکائیں اور جب جانور دوبارہ پشت کر کے بیٹھ گیا انہوں نے پانی کو آگے کیا اور دوبارہ...... وہ سیدھے کھڑے ہو گئے۔

''مجھے سمجھ نہیں آ رہی کہ یہ کھا کیوں نہیں رہا۔ کیا تمہیں پتا ہے کیوں نہیں کھا رہا؟''

''مجھے کچھ پتا نہیں......''

''کیا تم یہاں کسی خرگوشوں کے ماہر کو جانتے ہو؟''

''نہیں......''

''کیا چور باجی کو کچھ علم ہوگا؟''

''............؟''

وہ تیزی سے باہر گئے اور چور باجی اور یایالرگاؤں کے ابراہیم کو لے کر اندر آ گئے۔

''کیا تمہیں معلوم ہے یہ کھا کیوں نہیں رہا؟''

ابراہیم زیرِ لب مُسکرا رہا تھا۔

چور باجی نے کہا، ''دیکھیں استاد، آپ نے بے چارے کے آگے کئی چیزیں رکھ دی

ہیں۔ اس کو اس کی اپنی مرضی پر چھوڑ دو، یہ خود ہی کھانے لگے گا۔"

ناظم اپنی بھنچی ہوئی مٹھیوں کو اپنے کولہوں پر رکھے خرگوش کو بڑے انہماک سے دیکھ رہے تھے اور پھر بڑی سنجیدگی سے انہوں نے کہا، "مَیں سوچ رہا ہوں کہ یہ خرگوش مادہ ہے یا نر؟"

یایالرگاؤں کا ابراہیم قہقہے لگاتا ہوا دہرا ہو گیا۔ ہم سب ہنس رہے تھے، ناظم مونچھیں چبا رہے تھے۔

"تم کیوں ہنس رہے ہو؟ ہاں! تمہیں کس بات پر ہنسی آ رہی ہے؟ یہ تمہارے لیے اچنبھے کی بات نہیں ہونی چاہیے جو کہ یایالرگاؤں سے ہو۔ ہم سب ایسے ہی ہیں۔ ہمارے جیسے لوگ، معززین کے بیٹے، پاشاؤں کے بیٹے، ہم ایسے ہی ہیں۔"

یایالرگاؤں کا ابراہیم اب بھی دبے دبے قہقہے لگا رہا تھا۔ ناظم نے دوبارہ پوچھا، "کیا یہاں کوئی ایسا شخص ہے جو ان کا ماہر ہو؟"

آخر کار ابراہیم نے کہا، "ہاں...... ارطغرل ہے۔ اسے بلاؤ۔"

انہوں نے ارطغرل کو بلا بھیجا۔ وہ ایک ایسا آدمی تھا جو اس طرح کی باتوں کو بڑی سنجیدگی سے لیتا تھا۔ وہ جیل کے ہسپتال میں ایک اردلی تھا۔ وہ ضرور کسی کام میں مصروف تھا، کیوں کہ اس کے ہاتھ گیلے تھے۔ وہ بڑا سنجیدہ نظر آ رہا تھا، اس کی تیوری چڑھی ہوئی تھی۔

"استاد۔" اس نے کہا، "کیا حکم ہے؟"

ابراہیم اتنا ہنس رہا تھا کہ اس کا چہرہ سرخ ہو چکا تھا۔ اسے چوربا جی کے کندھے کا سہارا لے کر کھڑا ہونا پڑ رہا تھا۔

ناظم حکمت نے کہا، "یوں نظر آتا ہے کہ تم مصروف تھے ارطغرل...... مَیں تم سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں اگر تم برا نہ مناؤ، کیا پوچھ لوں؟"

ارطغرل اب بھی سنجیدہ اور تھوڑا بے صبرا نظر آ رہا تھا۔ ناظم نے اپنا سوال دہرایا، "کیا تم مصروف تھے؟"

"چھوڑو یار، خدا کے لیے جو پوچھنا ہے پوچھو، ہاں میں مصروف تھا!"

"اوہ! مجھے افسوس ہے۔ تو تم مصروف تھے۔"

ارطغرل واپس جانے کے لیے مڑا، یہ سمجھ کر کہ ہم اسے خواہ مخواہ میں پریشان کر رہے ہیں۔ لیکن ابراہیم نے اس کا راستہ روک لیا۔ اس کا چہرہ اب بھی لگاتار ہنسنے کی وجہ سے چمک رہا تھا۔

"دیکھو ارطغرل بے! استاد جو پوچھ رہا ہے وہ یہ ہے، ظاہری طور پر تم اس کے معاملات میں ماہر نظر آتے ہو، وہ جاننا چاہتا ہے کہ آیا یہ خرگوش نر ہے یا مادہ۔"

ارطغرل مسلسل بڑبڑاتا ہوا واپس چلا گیا جب کہ سب سر جھکا کر ہنسنے لگے۔ آخرکار چور باجی نے خرگوش کا مناسب معائنہ کیا اور اعلان کیا: "یہ نر ہے۔"

"اوہ! اچھا یہ ایک نر ہے، پھر تو اسے ایک بیوی کی ضرورت ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے ابراہیم؟ تم اس بارے میں کیا کہتے ہو؟"

ابراہیم کی ہنسی ابھی تک بند نہیں ہوئی تھی۔

"چھوڑیں استاد! اگر مَیں کر سکا تو پہلے اپنے لیے بیوی حاصل کروں گا۔"

قصہ مختصر، یہ خرگوش آنے والے دنوں اور ہفتوں میں ناظم کی اہم مصروفیت بن چکا تھا۔ مصوری اور شاعری کو ایک طرف کر دیا گیا تھا اور انہوں نے اپنی تمام توجہ خرگوش پر مرکوز کر رکھی تھی۔ جیسے ہی صبح ان کی آنکھ کھلتی وہ تیزی سے خرگوش کے پاس جاتے، اسے اس کے ڈبے سے اٹھا کر باہر نکالتے، اسے تھپکیاں دیتے اور اکثر اسے اپنے بازو میں لیے دوبارہ سو جاتے۔ ایک صبح وہ اٹھے اور اپنی خوابیدہ آنکھوں سے مجھے دیکھتے ہوئے سر کے اشارے سے مجھے صبح بخیر کہنے کی کوشش کی۔

"خرگوش......" مَیں نے کہا: "اسے بلی لے گئی ہے!"

وہ بجلی کی مانند بستر سے لپکے اور خرگوش کے ڈبے تک پہنچ گئے۔ خرگوش وہیں تھا جہاں وہ ہمیشہ ہوتا تھا۔

"تم نے حقیقت میں مجھے خوف زدہ کر دیا تھا!"

"اگر حقیقت میں اسے بلی لے گئی ہوتی تو پھر کیا ہوتا؟"

انہوں نے تھوڑا سا غور کیا۔

''تو خدا کی قسم، تم دیکھتے کہ میں بلیوں کی پوری نسل کا دشمن بن جاتا۔''

''ٹھیک ہے، لیکن تاہم اگر......''

''خدا معاف کرے! یہ بات ہی نہ کرو! یہ انسان ہے، جو پہلے تو ایک جانور کو پالتا ہے اور پھر اس قسم کی بکواس کرتا ہے......!''

خرگوش خوش وخرم، کھاتا پیتا، اپنی مرضی سے کوٹھڑی میں گھومتا پھرتا تھا۔ ایک صبح ناظم نے اسے ارطغرل کے بستر پر رکھ دیا۔ ارطغرل جانوروں کو صرف ناپسند ہی نہیں کرتا تھا بلکہ یہ اسے برہم کر دیتے تھے...... میں چپکے سے باہر نکل گیا اور ارطغرل سے اپنے بستر پر نظر ڈالنے کو کہا۔ وہ آیا اور جانور کو حقیقت میں اپنے بستر پر پایا۔

''استاد! آپ کو کیا حق حاصل ہے کہ جانور کو میرے بستر پر رکھیں؟''

''مجھے کیوں نہیں رکھنا چاہیے؟'' ناظم نے کہا۔

''یہ پیشاب کر دے گا، یہ غلیظ ہے۔''

''یہ تمہارا بستر ہے جو غلیظ ہے...... سمجھے۔'' انہوں نے اسے سونگھا۔

میں کسی دن آپ کے خرگوش کو مار ڈالوں گا!''

''تمہاری یہ جرأت!''

''ٹھیک ہے، آپ خود دیکھ لیں گے۔ ایک صبح آپ اسے مردہ پائیں گے!''

''ارطغرل اگر ایسا ہوا تو میں تمہارا ٹینٹوا دبا دوں گا۔''

آخر میں پیرائے بھابی آئیں اور خرگوش اپنے ساتھ لے گئیں اور ناظم اور باقی ماندہ ہم سب لوگ اس سے آزاد ہوئے...... ناظم واپس اپنی مصوری اور شاعری کی جانب پلٹ آئے۔

XI

وہ سٹرابیری کا موسم تھا۔ کسی نے ناظم کو سٹرابیریوں کی ایک ٹوکری تحفے میں دی۔ یہ بہت بڑی بڑی، پکی ہوئی، رس بھری، رنگا رنگ شان دار تھیں۔ ناظم نے وہ ٹوکری اپنے سینے کے ساتھ لگا رکھی تھی، ان کا چہرہ سٹرابیری کی طرح ہی سرخ نظر آ رہا تھا اور ان کی نیلی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔

''ذرا صبر کرو!'' انہوں نے کہا، ''تھوڑی سی آئسنگ شوگر (باریک پسی ہوئی چینی) منگوا لیں، پھر......''

ہم نے ایک وارڈر کے ذریعے آئسنگ شوگر منگوانے کا انتظام کیا۔ اس کے آنے تک ہم نے ایک ایک کر کے سٹرابیریوں کے وہ سبز پتے اتارنے شروع کر دیے جو ان کے سروں پر ٹوپی کی طرح لگے ہوئے تھے۔ اس دوران ناظم سٹرابیری کے بارے میں لکھی نظمیں دہرا رہے تھے جن میں اس پھل کی تعریفیں بیان کی گئی تھیں۔

''پتا ہے اب ہم کیا کریں گے؟ ایک تہ سٹرابیریز کی، ایک تہ آئسنگ شوگر کی، ایک تہ سٹرابیریز کی، ایک تہ شوگر کی...... پھر ہم اپنے چمچے سنبھالیں گے اور شروع ہو جائیں گے......''

سٹرابیریوں کے پتے اُتارتے ہوئے ہمارے منہ میں پانی بھر آ رہا تھا۔ جب آئسنگ شوگر پہنچ گئی، ہم نے ایک تہ سٹرابیریز کی لگائی، ایک تہ شوگر کی، ایک تہ سٹرابیریز کی، ایک تہ شوگر کی...... سب کچھ تیار تھا۔ لیکن جیسے ہی ہم اپنے چمچے لے کر ان پر جھپٹنے کو تیار ہوئے ناظم کو

ایڈمن آفس سے بلاوا آ گیا۔

''کیا مصیبت ہے! بڑی قسمت سے یہ سٹرابیریاں ہاتھ لگی تھیں اور ہم کھانے ہی لگے تھے کہ......''

وہ جانے کے لیے اُٹھے، لیکن سختی سے تنبیہ کر گئے، ''دیکھو، کوئی چالاکی یا دھوکا نہیں۔ میرے واپس آنے تک تم ایک بھی نہیں کھاؤ گے۔''

''مَیں وعدہ کرتا ہوں، مَیں ایسا نہیں کروں گا۔'' مَیں نے جواب دیا، ''لیکن اگر مَیں مجبور ہو گیا تو کیا کروں؟''

''ایسا سوچنا بھی نہ! تم مجھے زندگی میں پہلی مرتبہ کسی کو قتل کر دینے پر مجبور کر دو گے!''

مَیں نے قہقہے لگانے شروع کر دیے، وہ تیزی سے باہر نکل گئے۔ تھوڑی دیر بعد اسی تیزی کے ساتھ واپس آ گئے۔

''اب......'' انہوں نے کہا، ''اگر کوئی شخص آ کر کہتا ہے کہ تمہارے والد حکمت بے قبر سے اُٹھ کر آ گئے ہیں تو پھر بھی مَیں ان سٹرابیریوں کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔''

ہم نے اپنی اپنی سمتوں سے سٹرابیریوں پر حملہ کر دیا۔ ہم کھاتے گئے، کھاتے گئے، یہاں تک کہ ابھی چند سٹرابیریاں پلیٹ میں باقی پڑی تھیں کہ ہم پوری طرح سیر ہونے کے بعد اپنی پشتوں کے بل پیچھے اپنے بستروں پر جا گرے۔

''آہ!'' ناظم نے کہا، ''چلو اب مَیں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ مَیں نے کبھی جی بھر کر سٹرابیریاں نہیں کھائیں۔''

XII

دوستی کے ان ساڑھے تین سال کی تلخ و شیریں یادیں جو مَیں نے ناظم حکمت کے ساتھ جیل میں بسر کیے تھے، محض اُن واقعات تک ہی محدود نہیں جو مَیں نے یہاں بیان کیے ہیں۔ یہ تو محض وہ باتیں ہیں جو مَیں نے اپنی یادداشت پر انحصار کرتے ہوئے لکھ دی ہیں۔

میرے پاس نوٹ بکس تھیں جن میں مَیں نے روزنامچے کی شکل میں ناظم حکمت کے انتہائی مخصوص واقعات اور لمحات کو مقید کر رکھا تھا۔ ان میں اتنا زیادہ دستاویزی مواد موجود تھا کہ ان پر ایک ضخیم کتاب لکھی جا سکتی تھی۔ لیکن اب وہ میرے پاس نہیں ہیں۔

مَیں نے زیادہ سے زیادہ باتیں اور واقعات یاد کرنے کے لیے اپنے ذہن کو لیموں کی طرح نچوڑ کر آخری قطرہ بھی باہر نکالنے کی کوشش کی ہے۔ مجھے اس بات کا بھی بالکل احساس ہے کہ مَیں ناظم حکمت کے بارے میں اس طرح سے لکھنے کی اہلیت نہیں رکھتا جس کے وہ حقیقت میں حق دار ہیں۔

یہ آخری رات تھی جو ہم دونوں اکٹھے بسر کر رہے تھے۔ اگلے دن صبح سویرے جیل میں پانچ سال گزارنے کے بعد مجھے رہائی ملنے والی تھی اور مَیں اپنی آزادی سے ہمکنار ہونے والا تھا۔ اس شام مجھے اچانک شاعری کرنے کی تحریک ہوئی۔ مجھے یہ بات حقیقت میں دُکھ دے رہی تھی کہ مَیں انہیں جیل میں پیچھے چھوڑ کر جا رہا تھا۔ مجھے ایسے احساسات نے جکڑ رکھا تھا جو آپ اس وقت محسوس کرتے ہیں جب آپ اپنے والد یا والدہ، اپنے بھائی یا بہن یا خود اپنے بچوں کو چھوڑ کر

جا رہے ہوں۔ مَیں شدید صدمے کے عالم میں تھا۔ مَیں نے بغیر زیادہ غور وفکر کے چند سطریں یونہی لکھ دیں، مَیں ابھی انہیں ختم بھی نہ کر پایا تھا کہ وہ کوٹھڑی میں اندر آئے، تانبے کا وہ مگ ان کے ہاتھ میں تھا جس میں وہ ہمیشہ اپنی چائے پیا کرتے تھے۔ وہ شیلفوں میں سے کچھ ڈھونڈ رہے تھے، لیکن جو چیز وہ ڈھونڈ رہے تھے انہیں نہ مل سکی اور وہ باہر جانے ہی والے تھے کہ مَیں نے اپنی نظمیں ان کے ہاتھ میں تھما دیں۔ انہوں نے انہیں پڑھنا شروع کیا۔

انوکھی آزادی

ہاں

اس کا مطلب ہے

اس کا مطلب ہے تین دن کے عرصے میں

ہاں

جسے تم کہتے ہو

''انوکھی اور شیریں

آزادی''

''میرا عزیز ترین دوست

میرا استاد!''

کنکریٹ کی راہداریاں، لوہے کی سلاخیں، گرد آلود روشن بلب، یہ سب

کچھ دوسروں کے لیے چھوڑ جانا۔

ہاں

یہ آزادی

گھنٹی، تالے کی کلک، وارڈرز

ان کو پیچھے چھوڑ جانے کا اشتیاق!

لیکن

تمہیں دیکھنا نیلے آسمان کے نیچے سے
تمہیں پیچھے جیل میں چھوڑ جانا!
مَیں ایک مختلف قسم کی جیل میں چلا جاؤں گا
بغیر لوہے کی سلاخوں کے، بغیر تالوں کے
روشن بلبوں پر جمی گرد کے بغیر
اور بغیر وارڈر کے
ہاں! آزادی جس کا تم ذکر کرتے ہو۔
انوکھی ہے!
ریل گاڑیاں آتی اور جاتی ہیں
تم اپنے سائے ڈال سکتے ہو، جس گلی میں تم چاہو

....

....

کون سی آزادی
چھوڑو میرے دوست
میرے عزیز ترین پیارے استاد

O...O...O

ناظم حکمت کے نام

تم
"وہ شخص جو پرومیتھیس کی چیخوں کو
اپنے پائپ میں بھرتا ہے، گویا کہ وہ موٹا موٹا کٹا ہوا تمباکو ہو"
میری نیلی آنکھوں والے دوست
مَیں تمہیں کبھی بھی بُھلا نہ پاؤں گا۔

26 ستمبر 1943ء

تمہیں جیل میں تن تنہا چھوڑتے ہوئے

ہوا کو کاٹ کر پھسلتے ہوئے، تیسرے درجے کے ڈبے میں

مَیں تیزی سے اپنے آبائی قصبے کی جانب جاؤں گا

اور ریل گاڑی

سٹیشن میں کسی کبوتر کی طرح پھڑ پھڑاتی ہوئی داخل ہوگی،

ایک آنسوؤں میں ڈوبی عورت کے پاس

پانچ سال بعد

اس کا خاوند پہنچا دے گی

اس لمحے...... سٹیشن پر موجود لوگوں کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے

اپنی محبوبہ کے رخساروں کو چومتے ہوئے

تم میرے اندر بیٹھے

اپنی خوشی سے لبریز آنکھوں کے ساتھ مجھے دیکھ رہے ہوگے

اس لمحے جب ہر چیز کو دل سے نکال باہر کر دیا جائے گا

روئی، عداوت، خواہش

لیکن ناظم حکمت

اگرچہ تم اتنے زیادہ میلوں دُور ہو

اپنا بھورا سر میرے روشن دل کی دیواروں کے ساتھ ٹکائے ہوئے

تم اپنے دوست کو غروب ہوتے ہوئے گرما کے سورج کی افسردگی کے ساتھ رونے پر

مجبور کر دو گے۔

دن گزرتے جائیں گے

مَیں روزی کمانے کے دھندے میں الجھ جاؤں گا

فیکٹری

مشینیں

میرا بچہ

مَیں تمہیں چقندر اور سنگترے بھیجوں گا

میری بیوی اُونی جرابیں بُنے گی

ہر ہفتے ہم خط لکھیں گے

......بہ شرط یہ کہ مجھے فوج سے بلاوہ نہ آ گیا۔

مَیں تمہیں کیسے بھول سکتا ہوں؟

جیل کی راتیں جب ہم کھٹمل چن چن کر باہر نکالتے تھے

اور تمہارا مسلسل بڑی روانی سے مغلظات بکنا

جب ہم مشرقی محاذ کی خبروں کے لیے ریڈیو کے پاس انتظار کر رہے ہوتے تھے!

......ریڈیو کے نزدیک دیواروں پر

تم پنسل سے اداس انسانی چہروں کے خاکے کھینچتے تھے۔

مَیں تمہیں کیسے بھول سکتا ہوں

تم سے مَیں نے سیکھا تھا کہ دنیا اور لوگوں سے کیسے محبت کی جائے

شاعری اور مختصر کہانیاں لکھنے کا فن

اور ایک مرد کی طرح جدوجہد کرنا، یہ سب کچھ مَیں نے تم سے سیکھا!

O

انہوں نے میری جانب دیکھا، انہوں نے دوبارہ انہیں پڑھا، پھر انہوں نے گُم ایک

جانب رکھا، آنسو بھری ہوئی آنکھوں سے مسکراتے ہوئے مجھے گلے سے لگا لیا۔

''بہت شکریہ۔'' انہوں نے کہا، ''بہت شکریہ! تم مجھے اس سے زیادہ خوشی نہیں دے سکتے تھے، شکریہ!''

O

اور 26 ستمبر 1943ء کی صبح، جو کہ بہت تیز دھوپ لیے ہوئے تھی، مَیں اُن سے بار بار گلے ملا اور اپنے دیگر ساتھی قیدیوں کی پُر اشتیاق نگاہوں میں انہیں خدا حافظ کہا۔ انہیں جیل کے گیٹ پر چھوڑتے ہوئے، مَیں نے اپنا سوٹ کیس اپنے ہاتھ میں اٹھایا اور باہر نکل آیا.......

اگرچہ مَیں اپنے گھر واپس جانے، اپنے شہر لوٹنے اور اپنی پانچ سالہ بیٹی کو ملنے کے خیال سے جسے مَیں محض پینتالیس دن کی چھوڑ کر آیا تھا، بہت مسرور اور شاداں تھا، مَیں اتنا ہی زیادہ ناظم سے جدا ہونے پر افسردہ بھی تھا۔ یہ ایک ایسی دوستی تھی جو کسی بھی قسم کی حدود و قیود سے آزاد تھی۔

سڑکیں: سڑکیں دھول اور دھوپ سے اَٹی ہوئی تھیں۔

مَیں اپنی آنکھوں کے سامنے اُنہیں اور دوسرے قیدیوں خاص طور پر دوسرے تمام قیدیوں کو دیکھ سکتا تھا۔ وہ افسردہ تھے اور تقریباً رنجیدہ نظر آ رہے تھے، گویا کہ جیل میں ان کا پیچھے رہ جانا بھی میرا ہی قصور تھا۔

''چلو! تمہاری سزا تو پوری ہوئی!''

''تم نے یہ پانچ سال بہت خوب بسر کیے!''

''اب تو تمہارا سر آسمان کو چھو رہا ہوگا!''

''ایک گلاس میرے نام کا چڑھا لینا، ٹھیک ہے؟''

O

صرف ناظم جانتے تھے اور کسی بھی اور کو اس بات کا علم نہیں تھا کہ مَیں اپنی روح کا ایک بڑا حصہ جیل میں چھوڑ کر جا رہا تھا، اور یہ کہ مَیں اپنے ساتھ ان لوگوں کی دوستی کی گھر لے کر جا رہا تھا جو ابھی تک جیل میں تھے۔

اوانہ 1947ء

اور جان کمال کی دورانِ قید تحریریں

منگل، 19-5-1942

آج ایک ابر آلود نیم تاریک دن ہے۔ پھوار پڑ رہی ہے۔ فضا میں خنکی ہے۔ ہم کام پر نہیں جا سکے۔ ''لوگ کہتے ہیں بارش سونا ہوتی ہے۔'' ناظم نے کہا، پھر انہوں نے میز پر رکھے مرجھائے ہوئے پھول باہر نکالے۔ انہوں نے گلدان کا پانی تبدیل کیا اور جب وہ تازہ پھول واپس گلدان میں رکھ رہے تھے، ساتھ ساتھ گنگنا بھی رہے تھے۔ میں نے پوچھا، ''کیا آپ پھولوں کو گانا سنا رہے ہیں؟''

''بالکل۔'' انہوں نے جواب دیا، ''میرے پھول گیتوں کے عادی ہیں۔ وہ گیتوں کے ساتھ پروان چڑھتے ہیں......''

ہم نے کچھ دودھ پیا۔ ہم نے سکاؤٹنگ کے بارے میں باتیں کیں۔ ناظم حکمت ابھی تک اپنے پھولوں کو ترتیب دینے میں مصروف تھے۔ ارطغرل نے ہمیں بتایا کہ اس کی دادی جب استنبول لی سیزی میں سکاؤٹوں کو ڈرل کرتے ہوئے دیکھتیں تو کہا کرتی تھیں، ''اوہ! میں انہیں دیکھ کر بہت زیادہ خوش ہوتی ہوں۔'' ناظم حکمت نے کہا، ''یوں نظر آتا ہے کہ تمہاری دادی اچھی خاصی تماش بین بوڑھی چڑیل تھی۔'' ارطغرل نے اعتراض کیا۔ ناظم نے اس کے اعتراض پر اعتراض کر دیا۔ اور یہ کہتے ہوئے ''ہم نے اپنے پھولوں کو نئی ترتیب دے دی ہے''، وہ اٹھ کر

کھڑے ہو گئے۔ وہ دوسری جانب گھومے اور یوں نظر آئے جیسے کوئی فیصلہ نہ کر پا رہے ہوں کہ اب کیا کیا جائے۔ آخر کار وہ اپنے بستر پر بیٹھ گئے اور کہا، ''چلیں، اب اس جگہ کو کچھ ترتیب دے لیتے ہیں۔'' اور انہوں نے اپنے بستر کی سلوٹیں نکال کر اسے سیدھا کرنا شروع کر دیا۔ وہ کام کرتے ہوئے باتیں بھی کر رہے تھے، ''کل مَیں نے علاء الدین بے کو بتایا ہم کس طرح سے کارکنوں اور مزدوروں کو چوس رہے ہیں، وہ یہ سب سن کر بہت پریشان ہو گیا اور کہنے لگا، ''انہیں اس بات کا پتا نہ لگنے دینا۔''

O

21-5-1942

صبح کام کے لیے روانگی..... میں شام کو بے انتہا تھکا ہوا واپس آیا۔ اب میں ناظم حکمت کے ساتھ ہمارے کمرے میں ہوں۔ میں کہتا ہوں: ''اب آگے جو بھی ہو! آہ! یوں لگتا ہے جیسے ہمیں یہاں اضافی رقم ملی ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ کیا میں نے کسی سے زیادہ رقم لے لی ہے؟''

ان کے کسی دوست نے سائنوپ سے لکڑی میں نقش کاری کی کچھ چیزیں بھیجی ہیں۔ ناظم حکمت نے یقین دہانی حاصل کی کہ یہ چیزیں فروخت ہو جائیں۔ ان کے ڈاکٹر آف اکنامکس ہونے کے باوجود میں ان کے دس لیرا کو بیلنس کر پانے کی ناقابلیت پر خوب ہنسا۔ البانوی عاکف آ پہنچا۔ استاد اسے ایک آٹومیٹک سگریٹ کیس فروخت کرنا چاہتے ہیں۔ تمام سیلز پرسن اپنے گاہکوں سے اپنے چہروں پر مسکراہٹ کے ساتھ ملتے ہیں لیکن ہمارے دوست، ان کو دوسروں کی بے عزتی کے سوا کچھ نہیں سوجھتا، اور پھر وہ انہیں ڈانٹتے اور لیکچر دیتے ہیں۔

''خدا کے واسطے، (میری جانب مڑتے ہوئے) میرے لیے یہ کام کر دو۔ میں 14 لیرا میں سے 24 کورُش کیسے نکالوں؟ برائے مہربانی لکھنا بند کرو۔''

پھر وہ مرمرا شاکر کی بات کرتے ہیں:

''دو سلائی باکس 310 کے بنتے ہیں۔ ٹھیک ہے مرمرا؟ یہ بس اب پکی قیمت ہے۔ اوہ، مجھے مزید پریشان نہ کرو۔ باقی ہم دیکھ لیں گے۔''

O

22-5-1942

شام: ہم کام کی جگہ سے واپس جیل پہنچ گئے ہیں۔ ناظم حکمت، نجاتی اور گردسر جو کہ فوج میں کیپٹن رہ چکا تھا، کے ساتھ کسی مالی لین دین میں مصروف تھے۔ ناظم دیوار پر کچھ رقوم جمع کر رہے تھے۔ انہوں نے اپنا حساب کتاب ختم کیا اور باورچی خانے میں چلے گئے۔ اب ہم رات کا کھانا کھانے والے ہیں۔ ہمارا کھانا پتلے پکے ہوئے چاولوں پر مشتمل ہے جیسے کہ دلیہ ہوتا ہے، ایک ایسا کھانا جسے دیکھ کر آپ کہتے ہیں، "ہم اس کے لیے خدا کا شکر ادا کرتے ہیں اور کاش ہمیں اس کی ضرورت ہی نہ ہوتی!" ہم رات کا کھانا کھا کر اٹھے۔ ناظم حکمت قدرے افسردہ نظر آ رہے تھے۔ مَیں نے ان سے وجہ دریافت کی، "آج مَیں لکڑی کی ورکشاپ میں کام کرتا رہا ہوں۔ مَیں بہت تھک چکا ہوں۔" انہوں نے کہا۔ یہ بات ان پر زیب نہیں دے رہی تھی یا پھر شاید مجھ کچھ اجنبی سا احساس ہو رہا تھا جس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ ہم انہیں ہر وقت خوش گوار مزاج میں دیکھنے کے عادی تھے۔ آج رات اگر انہوں نے اچھی نیند لے لی تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میرا خیال ہے کہ وہ نیچے ریڈیو سننے چلے گئے ہیں۔

O

23-5-1942

رات کا وقت...... باہر ایک مینڈک کہیں سے آ گیا ہے۔ وہ لگاتار ٹرا رہا ہے، "ٹراں، ٹراں...... ٹراں۔" اس حرامی کی کیا تکلیف دہ آواز ہے۔ یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے کوئی اس کا گلا دبا رہا ہے۔ ناظم بھی اس سے تنگ ہو رہے ہیں۔

"کم بخت اپنے آپ کو پرندہ خیال کرتا ہے۔" وہ کہنے لگے، "شاید ہی کوئی دوسرا جانور ایسا ہو جو اپنے آپ کو اتنا اعلیٰ تصور کرتا ہو۔"

عین اس لمحے...... یوں محسوس ہوتا ہے کہ خدا کو بھی آج کوئی اور کام نہیں ہے...... اس نے مزید زور زور سے ٹرانا شروع کر دیا۔ "دیکھو!" ناظم حکمت کہنے لگے، "یوں لگتا ہے کہ اس نے ہماری باتیں سن لی ہیں۔"

O

24-5-1942

صبح: ناظم حکمت نے وہ بکس اٹھایا جو کہ انہوں نے لکڑی کی ورکشاپ میں کام کرتے ہوئے بنایا تھا۔ انہوں نے بڑے فخر سے ہم سب کو یہ دکھایا۔ ان کا عمومی رویہ کچھ اس طرح کا ہے کہ وہ کبھی بھی اس بات کے بارے میں شیخی نہیں بگھارتے جس میں وہ حقیقتاً مہارت رکھتے ہوں۔ تاہم اگر معاملہ ایسے میدان سے تعلق رکھتا ہو جس میں وہ پوری ہنرمندی نہ رکھتے ہوں اور نوآموز ہوں تو پھر بس خدا سلامت رکھے! مثال کے طور پر شاعری کے بارے میں وہ کہتے کہ وہ اس میدان میں بالکل نووارد ہیں اور یہ کہ ان کی دلی خواہش ایک اچھا لکھاری بننا ہے۔ اس کے برعکس وہ ایک زبردست بڑھئی ہونے کی ڈینگ مارتے ہیں۔ اس کے ثبوت میں اپنا بکس پیش کرتے ہیں۔

O

25-5-1942

آج صبح چھے بجے میری آنکھ کھل گئی۔ میں اٹھا۔ مجھے سیفٹی پن کی ضرورت تھی، میں نے اسے تلاش کرنے کے لیے سوٹ کیس کا ڈھکنا کھولا، جس نے کچھ چرچراہٹ پیدا کی، اس سے ناظم حکمت کی بھی آنکھ کھل گئی۔ ان کا مزاج بگڑ گیا۔ انہوں نے رضائی کے نیچے سے مجھے بیزاری کے ساتھ دیکھا۔ پھر وہ تیزی کے ساتھ بستر سے باہر نکلے۔ انہوں نے اپنی جرابیں چڑھائیں۔ اپنے جانے پہچانے ربر کے تلوں والے جوتے اٹھائے۔ ربر سول والے جوتوں کی بات کرتے ہوئے مجھے یاد آیا: اس سال ان جوتوں میں جو انہوں نے گزشتہ سال پانچ لیرا کے خریدے تھے، معمولی سی تبدیلی کی گئی تھی۔ ایڈمن آفس میں کاغذوں میں سوراخ کرنے والا پنچ استعمال کرتے ہوئے انہوں نے اس کے کینوس والے حصے میں سوراخ کر لیے تھے۔ انہیں انہوں نے ہوا کے لیے سوراخ قرار دیا تھا۔ میں نے ان کے بارے میں کل جب ہم باغ میں چہل قدمی کر رہے تھے، ان سے سوال کیا اور انہوں نے مجھے ان سوراخوں کے فوائد پر ایک لمبا لیکچر دیا۔

ان کا پاجامہ لینن کا ہے، ہمارے کمرے میں مکمل طور پر خاموشی ہے، سوائے ہمارے جاپانی کلاک کی ٹک ٹک کے۔ ناظم حکمت نے بڑے جوش کے ساتھ لینن کے اس پاجامے کو کھینچ

کھینچ کر ایک تیز سرسراہٹ کی آواز پیدا کرنا شروع کر دی۔ انہوں نے اپنی جیکٹ اٹھائی، اپنا قلم، نوٹ بک اور چمڑے کی تمباکو والی تھیلی اور باقی تمام اشیاء جواُن کی تھیں لیکن میری لکڑی کی پیٹی پر رکھی تھیں۔ پھر وہ نیچے جھکے اور کلاک کی جانب دیکھا۔ وہ باہر نکل گئے۔ کہاں گئے مَیں نہیں جانتا، میرا خیال ہے کہ شاید نیچے گئے ہوں گے جہاں ریڈیو رکھا ہے۔

خیر، یہ دنیا کا وطیرہ ہے۔ گزشتہ رات میں بستر پر لیٹا ہوا تھا، وہ اور ایوب آغا ''بیک گامن'' کھیل رہے تھے۔ مجھے بہت نیند آ رہی تھی۔ میری آنکھ لگ ہی رہی ہوتی کہ ''بیک گامن'' کی کھٹ کھٹ کی آواز سے دوبارہ کھل جاتی، ظاہر ہے اس صورتِ حال میں سونا مشکل ہو رہا تھا۔

لیکن وہ ریڈیو سننے نہیں گئے تھے۔ انہوں نے کوئی آدمی تلاش کیا تھا جو دودھ ابال دے اور مجھے بھی ایک گلاس بھجوایا تھا۔ وہ مجھے یہ بتانا چاہتے تھے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ جب مَیں نے انہیں جگایا تو میرا انہیں جان بوجھ کر پریشان کرنے کا کوئی ارادہ نہ تھا، تاہم وہ ہمیشہ اُن لوگوں کو معاف کرنے میں فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے تھے جنہوں نے انہیں کوئی آزار پہنچایا ہو۔

O

2-6-1942

شام: ناظم حکمت اب Radyo Gazetesi (ریڈیو اخبار) پر نورالدین آرتم کی پھیکی اور بے مزہ باتیں سن رہے ہیں۔ (نورالدین آرتم 1900-1958ء ایک لکھاری اور براڈ کاسٹر تھے جو دس سال تک ریڈیو انقرہ پر ''Radyo Gazetesi'' کے نام سے ملکی اور بین الاقوامی خبروں کا جائزہ پیش کرتے رہے)۔ چوں کہ ریڈیو میں بہت زیادہ نشریاتی خلل اندازی ہے، وہ نچلی منزل میں بجلی کی سپلائی کو مسلسل بند کر رہے ہیں۔

ناظم حکمت واپس آ گئے ہیں۔ شفا خانے کے دروازے پر وہ چلا رہے ہیں، ''ادھر آؤ! اسے کھولو! یہ دیکھو میرے پاس کیا ہے؟''

ان کے ہاتھ کہیں سے آدھا لیموں لگ گیا تھا۔

معمول کے مطابق وہ بڑبڑائے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے۔ ان کا کمرے میں داخل ہونے کا یہ غیر معمولی انداز بڑا مشہور ہے۔ وہ ایک بگولے کی مانند دروازے سے گھستے ہیں۔

اخبار، کاغذ، کتابیں، جیکٹ یا ویسٹ کوٹ ہر چیز اڑنے لگی ہے۔

بہر حال، وہ اندر آئے۔

"ہمارا استاد عجیب چیز ہے، ایک بالکل نرالی چیز۔" انہوں نے کہا۔ یہ جملہ مجھ پر کسا گیا تھا۔ مَیں نے ابھی ابھی اپنے پاؤں دھوئے تھے اور مجھے احساس ہوا کہ بالکل نادانستہ طور پر مَیں نے اپنا دایاں پاؤں میز کے اوپر رکھا ہوا تھا جہاں سلاد کا پیالہ پڑا تھا۔ مَیں نوٹ بک میں کچھ لکھنے میں مصروف تھا جو کہ میری دائیں ٹانگ پر رکھی ہوئی تھی۔ تاہم مَیں نے فوری طور پر اپنا پاؤں نیچے کر لیا۔

ناظم حکمت حقیقت میں ٹپٹائے ہوئے ہیں۔ وہ مچھلی بھون رہے ہیں۔ کالے انگوروں جیسی رس بھری چیریز فرائی پین میں پڑی ہوئی تھیں۔ آج رات ہمارا دستر خوان بہت غیر معمولی ہے۔ یہ یورپ سے ملتا جلتا ہوگا۔

"کیا کاظم بے یہاں ہے، کاظم بے یا ارطغرل؟"

ناظم شفاخانے کو جانے والی راہداری پر دوبارہ بگولے کی مانند جا رہے ہیں، خدا جانے وہ انہیں کیوں تلاش کر رہے ہیں۔ شفاخانے میں روشنیاں مسلسل جل اور بجھ رہی ہیں۔ شفاخانے کے آہنی دروازے سے ناظم اپنی پوری طاقت سے چلائے۔

"یہ جل رہی تھی، تم نے اسے دوبارہ بجھا دیا ہے۔ یہ جل رہی تھی جہاں ہم ہیں، تم سن رہے ہو، تم نے اسے دوبارہ بجھا دیا ہے!"

وہ تیزی سے کمرے میں آئے۔ انہوں نے احمت راسم کا ناول "Tacarib-i-Hayat" اٹھایا، اگرچہ ناول کسی غلط کاریوں سے مکمل طور پر مبرا ہے، اور اسے پھر دوبارہ نیچے رکھ دیا۔ مَیں حقیقت میں کچھ بھی نہ سمجھ سکا کہ وہ کیا چاہتے تھے۔

وہ یہ کہتے ہوئے کمرے سے نکل گئے: "ارے لڑکے! خدا کے لیے دروازہ کھول دو!" وہ تقریباً اڑتے ہوئے سیڑھیاں نیچے اتر گئے۔ وہ سپروائزر پر چیخ رہے ہیں، مَیں ان کی آواز سن سکتا ہوں۔

شفاخانے کے دروازے پر وہ الیکٹریشن کو بجلی کے بارے میں کچھ باتیں سمجھا رہے

ہیں۔ یہ آدمی یقیناً کافی احمق ہے کیوں کہ مَیں ناظم کی آواز کو لحظہ بہ لحظہ بلند ہوتی سن رہا ہوں۔

"اسے کھول دو!"

دروازہ کھل گیا ہے اور ناظم حکمت نیچے جاتے ہیں۔ وہ اپنے ہاتھ میں کانٹا اٹھائے ہوئے ہیں کیوں کہ جب ہنگامے کا آغاز ہوا، وہ باورچی خانے میں مچھلی تل رہے تھے۔ وہ تیزی سے اندر آئے ہیں۔

"تم نے کام شروع کرنے کے لیے یہ فیوز اتارا ہے!"

کسی کو سمجھ نہیں آ رہی کہ وہ کس کو کیا حکم دے رہے ہیں۔

"کیا یہ اب آ گئی ہے؟"

مَیں نے جواب دیا:

"ہاں! آ گئی ہے۔"

"کس طرف؟"

کسی نے کسی جانب سے جواب دیا......

ناظم حکمت کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے "اونہوں" کی آواز نکالی۔ شیلف سے کوئی چیز اٹھائی اور دوبارہ باہر چلے گئے۔ یہ سب کچھ دوپہر کے کھانے کے وقت تک جاری رہا۔

O

13-6-1942

سہ پہر کے پانچ بجے ہیں۔ بہت زیادہ گرمی ہے۔ ناظم حکمت اپنے بستر پر بیٹھے ہیں۔ ایک پتھر جو انہوں نے ہاتھ میں پکڑ رکھا ہے، اس پر وہ گُلِ لالہ کی تصویر بنا رہے ہیں۔ انہوں نے مٹانے والے ربر کی تلاش میں اِدھر اُدھر نگاہ ڈالی۔

"کیا تمہارے پاس ربر ہے؟"

میرے ڈبے میں ایک پڑا ہوا تھا۔ ناظم نے "اوہ" کہتے ہوئے اسے اٹھا لیا۔

"استاد!" مَیں نے کہا، "کیا آپ ہمارا ربر پتھروں کو رگڑتے ہوئے ضائع کر رہے ہیں؟"

انہوں نے قہقہہ لگایا۔ ''مَیں نے ایسا کوئی آدمی نہیں دیکھا جو تمہاری طرح بڑھا چڑھا کر بات کرتا ہو۔'' انہوں نے کہا۔

انہوں نے پتھر پر سے گل لالہ کو رگڑ کر مٹانا شروع کر دیا۔ مَیں زیرِ لب ہنسنے لگا۔

''چھوڑو یار! تم میرے گل لالہ کا مذاق کیوں اڑا رہے ہو؟'' انہوں نے کہا۔

تھوڑی دیر بعد وہ اٹھے اور شیلف پر کوئی چیز ڈھونڈنا شروع کر دی۔

''وہ ترک ڈیزائن کہاں ہیں؟ یہاں ایک تاریخ کی کتاب تھی۔ وہ یہاں ہونی چاہیے تھی۔''

مَیں نے قہقہہ لگایا۔ اس وقت میں نے یہ نوٹس لکھنا شروع کر دیئے تھے۔ ''رکیے! مَیں نے کہا، ''کیا آپ آہستہ آہستہ دہرا سکتے ہیں تاکہ مَیں انہیں یہاں لکھ سکوں؟''

ان کے ہونٹ کانپ رہے تھے جیسے کہ وہ اپنے آپ کو ہنسنے سے روکنے کی کوشش کر رہے تھے، ''دیکھو! تمہیں یہ کام مجھے بتائے بغیر کرنا چاہیے تھا، تاکہ مَیں معمول کے مطابق کام کر سکوں ورنہ میں تو ہلنے کے قابل بھی نہ رہوں گا۔''

جب کہ ناظم حکمت پتھر پر اُن رنگوں سے اپنا گل لالہ پینٹ کر رہے تھے جو اُن کی والدہ نے انہیں دیئے تھے (ہمیں معلوم ہوا تھا کہ انہیں Gouache کہا جاتا تھا)، مَیں انہیں مسلسل دیکھے جا رہا تھا۔ انہوں نے بغیر بازو کی بنیان اور سرخ دھاریوں والا پاجامہ پہن رکھا ہے اور گل لالہ میں رنگ بھرتے ہوئے ان کا نچلا ہونٹ باہر کو نکلا ہوا ہے۔ وہ اپنا برش گھاس سے بھرے ہوئے گدے سے صاف کرتے ہیں۔ وہ سیٹی بجا رہے ہیں۔ تصویر کشی کرتے ہوئے یہ ان کی ایک مخصوص عادت بلکہ ایک نہیں دو مخصوص عادات ہیں، جب وہ پینٹ کر رہے ہوتے ہیں، وہ ہمیشہ سیٹی بجاتے رہتے ہیں۔ اگر آپ ان کی سیٹی کو ذرا غور سے سنیں تو آپ آسانی سے اس رفتار کا اندازہ کر سکتے ہیں جس سے پینٹنگ کر رہے ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر جب وہ اپنی تصویر کے اس حصے میں رنگ بھر رہے ہوتے ہیں جو کسی خاص اہمیت کا حامل نہیں ہوتا تو پھر ان کی سیٹی تیز اور لگاتار بج رہی ہوتی ہے، جب وہ تصویر کے نازک حصوں میں رنگ بھرنا شروع کریں تو ان کی سیٹی سست اور نرم پڑ جاتی ہے۔ دوسری مخصوص عادت یہ ہے کہ وہ ایک آنکھ بند کر لیتے ہیں اور تصویر کو

آگے پیچھے حرکت دیتے ہیں، اس دوران وہ باریک بینی سے اس کے ہر پہلو کا جائزہ لے رہے ہوتے ہیں۔

پتھر جس پر ناظم حکمت گل لالہ پینٹ کر رہے تھے، وہ مجھے اور مرمرا شیو کی کو کیسل کے نزدیک ڈیلی نہر سے ملا تھا۔

گل لالہ کی تصویر ابھی تیاری کے مراحل میں تھی۔

بلغاریہ کا سیمت کمرے میں آ گیا۔

"استاد، ریڈیو کی خبریں تقریباً اختتام کو پہنچنے والی ہیں۔"

استاد نے پتھر کو، جو وہ پکڑے ہوئے تھے، نیچے رکھ دیا۔

"کیا واقعی؟ تم نے مجھے اس وقت کیوں نہیں بتایا؟"

وہ بھاگ کر شفا خانے (ڈسپنسری) کے دروازے پر گئے۔

"کھولو، کھولو!"

دروازہ کھل گیا۔ اب ہم نیچے سے آنے والی ریڈیو کی آواز سن سکتے ہیں۔

O

9-2-1943

آج صبح میری آنکھ ڈپٹی چیف وارڈر بصری آفندی کے ان الفاظ سے کھلی: "حسن بھی مر گیا ہے۔" وہ بڑی اونچی آواز میں شفا خانے کی راہداری میں بول رہا تھا۔

کل سے لے کر اٹھارہ گھنٹوں کے اندر اندر جیل کے غریب قیدیوں میں یہ تیسری موت ہے۔ ایک کی لاش کو کوڑے والی گاڑی میں رکھ کر جیل سے باہر نکال دیا گیا تھا۔ دوسری ہمارے ساتھ والے کمرے میں فارمیسی میں پڑی تھی۔

حسن پاگل تھا۔ وہ وارڈ 72 کے مکینوں میں سے ایک تھا۔

غربت: ہم اس کے اس قدر عادی ہو چکے تھے کہ صبح جب میں نے اس کی لاش دیکھی جو کہ محض ایک ہڈیوں کا ڈھانچا اور روئی کی طرح ہلکی تھی، میرے اندر کسی قسم کی ہمدردی کا جذبہ نہ جاگا بلکہ محض ایک بیزاری کا احساس پیدا ہوا۔ مجھے وہ اچھی طرح یاد ہے، میں اسے اکثر جیل کے

بھاری بھر کم آہنی دروازوں کے پاس کوڑے کے ڈھیر میں ہاتھ مارتے اور کچھ تلاش کرتے دیکھا کرتا تھا۔ اس کا دبلا پتلا ساز رد چہرہ تھا اور اس نے اپنی جیکٹ کے کالروں اور سامنے کے حصے پر کچھ رنگین کترنیں، ٹین اور ٹین کے ٹکڑے سی رکھے تھے۔ یہی کچھ اس نے اپنی ٹوپی کے ساتھ بھی کرر کھا تھا۔ لوگ اسے مذاق مذاق میں ''مارشل'' کہہ کر بلایا کرتے تھے۔

رات کے بارہ بج رہے تھے، مَیں نیم خوابیدہ حالت میں بستر پر لیٹا سونے کی کوشش کرر ہا تھا، جب ناظم حکمت نے میری ٹانگ کو اپنے ہاتھ سے جھنجھوڑا۔

''اُٹھو، ہوش کرو: کُرسک (Kursk) پر قبضہ ہو گیا ہے۔''

مَیں فوراً اُٹھ کر بیٹھ گیا، مَیں خوش تھا۔ ناظم حکمت ریڈیو ہمارے کمرے میں لے آئے تھے۔ انہوں نے ریڈیو کا پورا والیم کھول رکھا تھا۔ اس پر روس کا سرکاری اعلان نشر کیا جارہا تھا۔ ناظم حکمت پارے کی مانند اِدھر اُدھر بھاگے پھر رہے تھے۔ ان کے بھورے بال بکھرے ہوئے تھے اور آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔

''بہت خوب، کُرسک پر قبضہ کرلیا گیا ہے۔''

''کُرسک پر قبضہ ہو گیا ہے یہ بڑی بات ہے، بہت خوب......''

''کل خرکوف (Kharkov) ہوگا اور پھر روسٹوف (Rostov) اور پھر......''

انہوں نے ارطغرل کو جگایا۔

''ارطغرل، ارطغرل، سنو، کُرسک پر قبضہ کرلیا گیا ہے۔''

نیند میں ڈوبے ہوئے ارطغرل نے کہا: ''مَیں نے سن لیا ہے۔''

پھر ناظم حکمت نے ریڈیو اٹھایا اور نیچے علاء الدین بے کے وارڈ میں چلے گئے۔

وہ ہر شام کو ہر معاملے میں ایسے ہی کرتے۔ روسی سرکاری اعلامیہ سننے کے بعد اور یہ جاننے کے بعد کہ کون سے شہروں پر روس کا دوبارہ قبضہ ہو گیا ہے وہ تیزی سے علاء الدین بے کے وارڈ میں جاتے۔ وہاں ایک تفصیلی نقشہ آویزاں تھا اور وہ اس نقشے پر دوبارہ قبضے میں لیے گئے شہروں کو تلاش کرتے، ناظم کے لیے یہ بالکل معمول کا ردِعمل تھا، اور ان کی کوئی معاندانہ بدخواہانہ نیت نہیں ہوتی تھی لیکن ہمارا قابلِ احترام علاء الدین عرف اونٹ بہت زیادہ ناراضی کا اظہار کرتا

اور اسے یہ کہتے بھی سنا گیا تھا: ''ناظم حکمت مجھے آدمی رات کو جگانے آ جاتا ہے۔ جب جرمن آخر میں اپنے موسم سرما کے حملوں کا آغاز کریں گے، پھر مَیں اُسے آ کر جگایا کروں گا۔''

یہ اونٹ ایک احمق آدمی ہے۔ وہ جو باتیں کرتا ہے محض تصوراتی ہیں لیکن اگر اس نے کبھی مجھے یوں جگانے کی کوشش کی تو مَیں اس پر میز اور کوئلوں والی انگیٹھی اٹھا کر پھینکنے کے لیے تیار ہوں گا۔

O

بدھ، 10-02-1943

برف گر رہی ہے۔ مَیں اور ناظم حکمت دونوں 10 بجے سے کافی بعد اٹھے ہیں۔ روس نے گزشتہ رات ایک اور سرکاری اعلامیہ جاری کیا تھا۔ ہم نے وہ سنا اور مَیں نے تھوڑا سا مطالعہ کیا، پھر دوبارہ بستر میں گھس گیا۔ شفا خانے کی جانب سے آنے والے بلند شور کی وجہ سے آدمی رات کے قریب میری آنکھ کھلی۔ یہ باتیں، شور اور اچھل کچھ دیر جاری رہے۔ ایک موقع پر ہمارے کمرے کا دروازہ کھلا، دو آدمی اندر آئے۔ کمرے میں اندھیرا تھا اور پتا نہ چل سکا کہ وہ کون ہیں۔ ناظم حکمت چلاتے ہوئے اچھل کر بستر سے اُٹھے۔ دونوں نے جو اندر آئے تھے، اپنا تعارف کروایا۔ وہ ارطغرل اور رجب تھے۔ انہوں نے ہمیں بتایا کہ کیا ہوا تھا، شفا خانے کا ایک اردلی نوری غضب ناک ہو گیا تھا۔

O

بدھ، 17-2-1943

اموات تیزی سے واقع ہو رہی ہیں۔ دو اور بوڑھے آدمی بھی گزر گئے ہیں۔ ان میں سے ایک علی بابا اور دوسرا امین دیدے ہے (نانا کو ترکی میں دیدے کہتے ہیں)۔ علی بابا چھوٹے قد کا سفید چشموں والا آدمی تھا جو آپ کو پرانے دَور کی عرضی نویسوں کی یاد دلاتا تھا۔ وہ ایک خاموش طبع، جھریوں سے بھرے چہرے والا اپنے آپ میں مگن انسان تھا۔ انتہائی درجے کا کمینہ لیکن پسندیدہ شخص تھا۔ اس کی قید کے پندرہ سال ابھی باقی تھے لہٰذا آپ کہہ سکتے ہیں کہ موت اس کے لیے رہائی کا پیغام تھی۔ امین ایک دلچسپ کردار تھا: ''مَیں نے کوے دیکھے.....''

اور ''ایک دھات ہے جو کہ پیتل ہے، ایک آدمی ہے جو کہ ولد الحرام ہے'' جیسے مصرعے جو ناظم حکمت نے Ülkem Insan Manzaraları میں استعمال کیے ہیں، امین سے متعلق تھے۔

وہ مکمل طور پر ٹوٹ پھوٹ چکا تھا اور قابل رحم حالت میں تھا۔ وہ ایک جوشیلا اور سرگرم مسلمان تھا، بہت کٹر قسم کا مسلمان۔ ہم کئی مرتبہ ایک ہی شفٹ میں اکٹھے کام پر جا چکے تھے۔ وہ اپنے سینے پر سرخ ربن میں ایک تانبے کا تمغہ پہنتا تھا۔ وہ اسے اپنی پیوند لگی گندی قمیص پر پن کرنا کبھی نہ بھولتا تھا۔ واحد چیز جس پر وہ اس دنیا میں فخر کر سکتا تھا، یہ تمغہ تھا۔ میرا خیال ہے کہ اس نے یہ بلقان جنگ میں حاصل کیا تھا، لیکن یہ اس سے بھی پرانا ہو سکتا تھا۔ یہ انتہائی مذہبی انسان کیا ردعمل ظاہر کرتا اگر وہ جانتا کہ اُسے بغیر غسل کے دفن کر دیا گیا تھا۔

چیچک کی وبا پورے زوروں پر تھی۔ پہلی ویکسی نیشن جو ہمیں دی گئی اس نے مطلوبہ نتائج پیدا نہ کیے، لہٰذا ناظم حکمت کو اگلے دن دوبارہ ویکسی نیشن دی گئی۔ مَیں یہ کروانے میں بے پروائی برتتا رہا ہوں۔ میرا علی بابا، امین دیدے اور بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح مرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ مجھے دنیا سے پیار ہے اور یہ سمجھتا ہوں کہ مجھے اس دنیا پر بہت کچھ حاصل کرنا ہے۔

اب صبح کا وقت ہے۔ گزشتہ شب ناظم یہ اچھی خبر لائے تھے کہ خرکوف پر قبضہ واپس لے لیا گیا تھا۔ وہ اس وقت سو رہے ہیں یا شاید سو نہیں رہے بلکہ رضائی اوڑھے آنکھیں بند کر کے خیالات میں کھوئے ہوئے ہیں۔ آج کے دن سے ہم اکٹھے کھانا بند کر رہے ہیں۔ یہ بات ان کے اصرار پر طے ہوئی ہے۔ اگر ایک یا دو ماہ میں وہ اپنے بجٹ کو متوازن کر لیتے ہیں تو ان کا کہنا ہے کہ ہم دوبارہ مل کر کھانا شروع کر دیں گے۔ انہوں نے کہا ہے، ''مجھے 10 لیرے ماہوار میں گزر بسر کرنا ہوگی۔'' گویا کہ مَیں اس سے زیادہ خرچ کر سکتا ہوں۔

O

پیر، 5-4-1943

گزشتہ رات مجھے اپنی بیوی کے بارے میں خواب آیا۔ نہیں، مَیں نے اسے دیکھا نہیں، لیکن خواب اس کے بارے میں تھا۔ خواب کچھ یوں تھا کہ مجھے رہا کر دیا گیا ہے اور مَیں

ادانہ چلا گیا ہوں۔ مَیں تھکا ماندہ گھر پہنچا، نہانے اور کپڑے تبدیل کرنے کے بعد میں دیوان پر لیٹ گیا۔ میری بہنیں اب بڑی ہو چکی ہیں، وہ میرے گرد جمع ہیں اور جیل مَیں میرے پانچ برسوں کے بارے میں ہر قسم کی باتیں پوچھ رہی ہیں۔ اچانک مجھے یاد آیا، میری بیوی کہاں ہے، میری بیٹی کہاں ہے؟

میری والدہ کہتی ہیں، ''وہ ہوٹل الدان میں ہیں، تمہارے والد نے انہیں وہاں بھیجا ہے۔'' اوہ، میرے خدایا......! مَیں حقیقت میں بہت پریشان ہو گیا۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہی کہ کس پر اپنا غصہ نکالوں۔ ہزاروں خیال میرے ذہن میں دوڑنے لگے۔ ایک بیس سال کی نوجوان عورت ہوٹل جیسی مشکوک جگہ پر اکیلی تنہا رہ رہی ہے...... مَیں پاگلوں کی طرح دیوان سے اٹھتا ہوں۔ مَیں جتنی جلدی ہو سکے کپڑے پہننے کی کوشش کرتا ہوں، لیکن کوئی صورت نہیں بنتی، یہ بالکل ایسا ہی ہوتا ہے جیسے ڈراؤنے خوابوں میں ہوتا ہے۔ جب آپ بھاگنا چاہتے ہیں لیکن آپ کے قدم بھاری ہو جاتے ہیں اور آپ حرکت بھی نہیں کر سکتے۔ مَیں بڑی سست رفتاری سے کپڑے تبدیل کر رہا ہوں اور اس وجہ سے مَیں اتاؤلا ہو جاتا ہوں۔ آخر کار مَیں اپنا پاجامہ پہننے میں کامیاب ہوا اور اپنی جیکٹ اٹھاتے ہوئے گھر سے نکلنے ہی لگتا ہوں کہ میری آنکھ کھل گئی۔ اس طرح میں خواب میں بھی اپنی بیوی کو دیکھنے سے محروم رہ گیا۔ ہم ایک ایسی دنیا میں رو رہے ہیں جہاں ایک آدمی حقیقی زندگی کو تو ایک طرف رہنے دیں، خواب میں بھی اپنی بیوی کو دیکھنے میں کامیاب نہیں ہوتا۔

صبح کا آغاز تاریک اور دھند آلود ہے۔ باہر منجمد کر دینے والی سردی ہے۔ مَیں اس قدر پریشان ہوں کہ اگر مَیں کسی کے گلے نہ پڑا تو یہ بہت بڑی بات ہوگی۔

ناظم حکمت نے امین بے کے ساتھ مل کر ٹالسٹائی کا ''وار اینڈ پیس'' دوبارہ شروع کر دیا ہے۔ مَیں نے چائے کے گلاس میں لبالب بھر کر کافی پی ہے اور اپنی بساط کے مطابق بہترین سگریٹ سلگایا ہے۔ مَیں ابھی تک غصے میں ہوں۔

ناظم حکمت کو ان دنوں بھوک خوب کھل کر لگ رہی ہے۔ وہ ناشتہ کر کے واپس آئے ہیں۔ ان کے بال گھنے، بھورے اور گھنگھرالے ہیں۔ اپنی گردن کے گرد انہوں نے ہلکے سبز رنگ کا رومال باندھا ہوا ہے، جو ان کی اپنی کھڈی بنا ہوا ہے۔ انہوں نے سمور کے کالروں والا

اوور کوٹ پہن رکھا ہے۔ اس حلیے میں وہ کسی ملک کے عزت مآب شہزادے کی طرح نظر آرہے ہیں۔ وہ اپنے تیس سالہ پرانے متروک ٹائپ رائٹر کے سامنے بیٹھے ہوئے ہیں جس پر شکاگو کا ٹریڈ مارک بنا ہوا ہے، اور ایمن بے، تالستائی کے ترجمے کا مسودہ پڑھ رہا ہے۔ ناظم حکمت اسے ایسی رفتار سے ٹائپ کر رہے ہیں جو کسی نوآموز کی رفتار نظر نہیں آرہی۔ حقیقت میں وہ قابل تعریف رفتار سے ٹائپ کر رہے ہیں۔ اس ٹائپنگ کی نشست سے پہلے ہمارے درمیان درج ذیل باتیں ہوئی تھیں۔ مَیں نے اُن سے ایک عجیب وغریب سوال پوچھا تھا، اب مجھے وہ یاد نہیں آرہا اور انہوں نے کیا جواب دیا۔ اوہ! ہاں مجھے اپنا سوال یاد آ گیا ہے۔ مَیں نے اُن سے ایک فرانسیسی لفظ "Limaçon" کا مطلب پوچھا تھا۔

''سچی بات تو یہ ہے کہ مَیں نہیں جانتا۔'' انہوں نے کہا، ''جہاں تک مچھلیوں کا تعلق ہے مَیں مچھلیوں میں سے صرف وہیل مچھلی کو شناخت کر سکتا ہوں۔ یہ بات تم پہلے ہی بہ خوبی جانتے ہو۔''

ہم سب خوب ہنسے، انہوں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا، ''درختوں کے معاملے میں مَیں آج تک میپل، ایش اور سائپرس میں تمیز نہیں کر سکا۔ مَیں صرف پاپلر، بید مجنوں اور چیڑ کے درختوں سے بہ خوبی واقف ہوں۔''

وہ ہر بات ایسے عمدہ انداز میں کرتے ہیں کہ مَیں بلا جھجک کہہ سکتا ہوں کہ ان کے منہ سے نکلنے والے ہر لفظ سے شہد ٹپک رہا ہوتا ہے۔ وہ صرف ایک شاعر نہیں ہیں۔ ان کا اٹھنا بیٹھنا، اوڑھنا بچھونا سب شاعری ہے۔ وہ مجسم شاعری ہیں۔ شاعری ان کے وجود میں اس طرح سے کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے کہ ان کے انگ انگ سے پھوٹ رہی ہوتی ہے۔ وہ شاعری کے لیے بنائے گئے ہیں اور شاعری اُن کے لیے بنی ہے۔ مَیں یہ سب کچھ محض ان کی ستائش وتوصیف میں نہیں لکھ رہا، مَیں اپنے تعلقات سے قطع نظر یہ باتیں لکھ رہا ہوں۔ ہمارے درمیان تعلقات محض استاد اور شاگرد والے نہیں ہیں۔ ہم گاہے بہ گاہے جھگڑتے بھی ہیں، ایک دوسرے کے ساتھ سخت الفاظ کا تبادلہ بھی کرتے ہیں اور کئی کئی روز آپس میں بات چیت بھی نہیں کرتے۔ میرے کہنے کا مطلب ہے کہ بالکل اسی طرح جس طرح آپ عام لوگ آپس میں بحث مباحثہ کرتے ہیں،

جھگڑتے ہیں اور ایک دوسرے سے بولنا بند کر دیتے ہیں، مَیں اور ناظم بھی کبھی کبھی یہ سب کچھ کرتے ہیں۔ مَیں تھوڑا مزید آگے جاتے ہوئے یہ بھی تسلیم کرتا ہوں کہ حسد کے جذبات، اپنے آپ کو بہت اہم خیال کرنا، جو کہ ہر شخص کی سرشت کا کھلم کھلا یا پوشیدہ حصہ ہوتے ہیں، مَیں تسلیم کرتا ہوں کہ دوسروں کے بارے میں میرے اندر یہ جذبات اکثر پیدا ہو جاتے ہیں۔ لیکن ناظم کے بارے مَیں کبھی بھی یہ محسوس نہیں کر سکا حتیٰ کہ جب مجھے اُن پر شدید غصہ ہوتا ہے تب بھی میرے اندر یہ جذبات پیدا نہیں ہوتے۔ میرے لیے وہ ہمیشہ ایک معماتی، ماورائے رسائی، مبالغے کی حد تک شاعری کی ایک مشین کی حیثیت رکھتے تھے۔

مَیں نہیں جانتا کہ میں یہ سب کچھ کیوں لکھ رہا ہوں۔ لیکن مَیں یہ بات یقینی طور پر جانتا ہوں کہ مَیں اُن سے بہت زیادہ محبت رکھتا ہوں۔ اس محبت سے بالکل مختلف جو مَیں ایک بھائی، استاد یا کیا کہوں ایک آقا یا ایسے ہی کسی شخص کے لیے محسوس کرتا ہوں جس میں اپنے والد، اپنی والدہ، اپنی بہنوں اور اپنی بیٹی کے لیے تمام محبتوں کے دھارے شامل ہیں۔ اور اگرچہ ہم نہیں جانتے کہ ہم میں سے پہلے کون اس دنیا کو چھوڑ کر جائے گا، مَیں ان کے بارے میں سوچتا ہوں جب مَیں ان کی موت کی خبر سنوں گا یہ جہاں بھی ہو اور جیسے بھی ہو، مَیں ان کی موت کی خبر کا کیسے سامنا کر پاؤں گا؟ مَیں ان کی موت کو عبدالحق حامد (شاعر عبدالحق حامد ترہان 1851-1937ء) کی موت جیسا خیال کرتا ہوں۔ مَیں ہر اس ہستی کے لیے یہی جذبات رکھتا ہوں جس کے لیے میں شدید محبت رکھتا ہوں۔

مختصراً مَیں ناظم حکمت سے اتنی محبت کرتا ہوں کہ بعض اوقات میں ان پر "ایک اچھا آدمی ہونے، ایک عظیم شخصیت اور ایک نمایاں انسان ہونے کی بنا پر جو عام لوگوں کی پہنچ سے دُور ہے" سخت ناراض ہو جاتا ہوں۔ اس حوالے سے مَیں کچھ مزید باتیں بھی کرنا چاہوں گا۔

بعض اوقات وہ اس قدر بردباری کا مظاہرہ کرتے ہیں کہ مَیں غصے سے پاگل اور بے قابو ہو جاتا ہوں۔ مثال کے طور پر جیل میں لوگوں کا ایک گروہ ہے جن سے ہمارا اکثر سامنا ہوتا رہتا ہے۔ یہ ٹائیاں باندھنے والے جعلی شرفا ہیں، جن میں اکاؤنٹنٹ، کیشیئر (بجائے خزانچی کے مَیں جان بوجھ کر حقارت کے طور پر کیشیئر کہتا ہوں)، کلرک، قرضہ وصول کرنے والے، نچلے متوسط

طبقے کے افراد شامل ہیں۔ ان کا کردار صاف نظر آتا ہے۔ ان کے گھمنڈ کا کوئی جواز نظر نہیں آتا۔ ان کے ہر عمل اور ہر بات سے اپنی ذات پر فخر کا احساس نمایاں نظر آ رہا ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ان میں سے کوئی ناظم کو کہتا ہے:

''دیکھو ناظم!'' (وہ انہیں محض نام لے کر پکارتے اور ان کے نام کے ساتھ کوئی تکریم کا سابقہ یا لاحقہ مثلاً ''جناب یا استاذ'' یا ''ناظم بے'' استعمال نہ کرتے۔ لیکن اپنے لیے وہ ان الفاظ کے استعمال پر اصرار کرتے اگر آپ ان کے نام ان کے بغیر لیتے تو وہ ناراض ہو جاتے اور آپ کے خلاف دل میں بغض رکھتے اور آپ کی پیٹھ پیچھے آپ کو برے الفاظ سے یاد کرتے)۔ ''دیکھو ناظم! تم لوگوں کو سمجھ نہیں سکتے۔ تم کسی کے کردار کو پرکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔''

جب وہ ایسی باتیں کر رہے ہوتے تو یہ لوگ ایک لمحے کے لیے بھی یہ نہ سوچتے کہ وہ ایک ایسے شخص سے بات کر رہے ہیں جو عظیم شاعر، ڈرامہ نویس، سیاسی لکھاری، سکرپٹ رائٹر، مختصر کہانیوں کا مصنف اور ایک ناول نگار ہے، مختصراً، وہ اُس ہستی سے مخاطب ہیں جسے ''روحوں کا مہندس'' کہا جاتا ہے اور یہ درجہ اسے کسی ایری غیری یونیورسٹی کے ڈپلومے یا سند کی وجہ سے حاصل نہیں بلکہ اس کی اپنی خداداد صلاحیت کا مرہون منت ہے۔ جب کہ مَیں اس شخص پر جو یہ کہتا، ''ناظم تم کسی کے کردار کو پرکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے'' سخت برہم ہو جاتا، ناظم محض مسکراتے رہتے اور خالی خالی آنکھوں سے اسے دیکھتے رہتے۔ مَیں جانتا ہوں کہ یہ نگاہ کس قدر خالی اور بے معنی ہو سکتی ہے، لیکن یہ نگاہ صرف اس کے لیے ایک پیغام رکھتی تھی جو اسے سمجھنے کے لیے ضروری ذہانت رکھتا تھا۔ جب ناظم اس طرح خالی نگاہوں سے دیکھ رہے ہوتے، تو کسی کو علم نہ ہوتا کہ وہ کیا سوچ رہے ہیں، وہ اس احمق آدمی کو پوری طرح سے سمجھ رہے ہوتے، اس کے مافی الضمیر کو ایک کھلی کتاب کی طرح پڑھ رہے ہوتے۔ وہ ایسے لاکھوں انسان دیکھ چکے تھے۔ ان کے لیے وہ اتنا ہی معروف ہوتا جتنا ان کی اپنی ذات، گویا کہ وہ آئینے میں دیکھ رہے ہیں۔

جو بات مجھے سب سے زیادہ طیش دلاتی وہ ناظم کا لاتعلقی کا روّیہ تھا۔ مَیں چاہتا تھا کہ وہ اس آدمی پر فوراً غصے میں آ جائیں جو انہیں کہتا، ''تم لوگوں کے کردار کو پرکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے'' اور مَیں چاہتا تھا کہ وہ اس پر گرجیں، برسیں اور اسے دھمکیاں دیں۔ کئی دفعہ مَیں خود یہ کام

کرنے کا سوچتا، لیکن پھر مجھے خیال آتا کہ اگر کچھ کہنے کی ضرورت ہوئی تو ناظم خود بہتر طور پر سمجھتے ہیں کہ کیا کرنا ہے وہ ایسے آدمی نہیں ہیں جو اپنا دفاع نہیں کر سکتے لہٰذا مَیں ان کے دفاعی مشیر کا کردار ادا نہیں کر سکتا۔ اگر ضرورت ہوئی تو مَیں ان کی کسی دوسرے طریقے سے مدد کروں گا۔ لہٰذا اپنی فطری جبلتوں کے شدید دباؤ کے باوجود مَیں شدید غصے میں اٹھ کھڑا ہوتا اور گالیاں دینا شروع کر دیتا اور منظر سے غائب ہو جاتا۔ کسی کو سمجھ نہ آتی کہ مَیں کس کو گالیاں بک رہا ہوں اور کیوں گالیاں دے رہا ہوں۔

چلیں اس بات کو چھوڑتے ہیں اور اپنی بات کی جانب واپس آتے ہیں۔ ناظم حکمت نے بات کرنا جاری رکھی:

''مَیں شاہ بلوط کے درخت کو بھی شناخت کر سکتا ہوں، لیکن صرف اس وقت جب اس پر پھل لگا ہوا ہو...... پھولوں کے معاملے میں مَیں گلاب اور ڈیزی کو پہچانتا ہوں۔''

امین بے نے سوال کیا:

''تتلی کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟''

انہوں نے شاعری پیدا کرنے والے ڈائینمو کی طرح جواب دیا:

''تتلی؟ مَیں نے زندگی میں پہلی مرتبہ کسی ایسی مضحکہ خیز چیز کے بارے میں سنا ہے۔''

جیسا کہ ہم آپس میں باتیں کر رہے ہیں، جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں مَیں اسے سگریٹ کے پیکٹ کی پشت پر لکھتا جا رہا ہوں۔ میرے پاس لکھنے کے لیے فی الحال یہی ہے۔ بعد میں مَیں اسے اپنی ڈائری پر نقل کر لوں گا۔ اب وہ پورے انہماک سے ٹائپنگ کر رہے ہیں اور مَیں اپنی بیوی کو خط لکھنے کی تیاری کر رہا ہوں۔

O

6-4-1943

رات کا وقت۔ ناظم حکمت اپنے ٹائپ رائٹر پر بیٹھ چکے ہیں۔ وہ اپنی بیوی کو خط لکھنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ ٹائپ رائٹر میں کاغذ لگاتے ہوئے وہ مجھے کہتے ہیں:

''کیا تمہیں معلوم ہے کہ جو کچھ تم نے میرے بارے میں لکھا ہے مجھے سب سے زیادہ کیا بات پسند آئی ہے؟'' (جو کچھ مَیں نے اوپر لکھا ہے، وہ ابھی ابھی مَیں نے انہیں پڑھ کر سنایا تھا)۔

''کیا؟''

''ٹائپنگ میں میری مہارت، مَیں بہت چاہتا تھا کہ اس کی تعریف کی جائے......!''

آپ سوائے مسکرانے کے کیا کر سکتے ہیں۔ مَیں نے آپ کو بتایا ہے ناں کہ وہ کمال کی چیز ہیں۔

ناظم حکمت کے خطوط

اور رحان کمال کے نام

جون 1944ء

میرے بھائی رشید،

مَیں نے بہت زیادہ لطف لیتے ہوئے تمہارا خط دو مرتبہ پڑھا ہے اور اب مَیں اسے دوبارہ پھر پڑھوں گا۔ تمہاری تحریریں شان دار ہیں، نظمیں بھی اچھی تھیں۔ صرف ایک بات، میرے خیال میں ذہنی کیفیت کو بیان کرتی ہوئی ایسی مختصر نظموں میں، ان فی البدیہہ اشعار میں ایک اچھی قافیہ بندی ہونی چاہیے۔ جیسے کہ تم کہتے ہو، شاعری دراصل اپنے خیالات کا ایک ہنرمندانہ اور ماہرانہ اظہار ہے۔

لیکن جس چیز نے مجھے تمہارا خط دو مرتبہ پڑھنے پر مجبور کیا اور اب دوبارہ دو مرتبہ پڑھنے پر مجبور محسوس کر رہا ہوں، وہ ہے جو تم نے میری بہت ہی پیاری نواسی ''یلدز'' کے بارے میں لکھا ہے۔ میرے تصور کی آنکھ میں وہ زندگی سے بھرپور ایک پیاری سی چھوٹی سی بچی ہے۔ اور میں اس کو اس قدر عزیز رکھتا ہوں کہ اس مقام پر آ کر رو پڑا جہاں تم نے لکھا ہے کہ اپنی ماں سے پٹنے کے بعد وہ تمہارے پاس شکایت لے کر آئی۔ مہربانی کر کے میری بیٹی کو بتا دو کہ اگر اس نے یلدز کو دوبارہ پیٹا تو مجھے اس کے مدمقابل آنا پڑ جائے گا۔ آپ اس قدر پیاری اور ذہین مخلوق کو سخت ہاتھ لگانا بھی گوارا نہیں کریں گے، خواہ وہ کوئی بلی ہی کیوں نہ ہو اور یہ تو میری انمول پیاری سی ''یلدز'' ہے۔

دیکھو دوست میری تم سے اور اپنی بیٹی سے ایک درخواست ہے، مَیں یہ کہتے ہوئے قدرے سراسیمہ محسوس کر رہا ہوں اور اس بات پر مجھے معاف کر دینا، اور مَیں یہ بات ابھی سے ہی تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ اگر یہ کسی بھی وجہ سے ناممکن ہو تو مجھے کوئی ناراضی یا خفگی نہ ہو گی۔ بات یہ ہے کہ نیا بچہ جو پیدا ہونے والا ہے اگر لڑکا ہوا تو اس کا نام ناظم رکھنا۔ لیکن جیسا کہ مَیں نے کہا ہے اگر اس بارے میں تم پہلے ہی کوئی وعدہ کر چکے ہو یا کوئی اور مجبوری ہو تو مَیں اپنی درخواست واپس لے لوں گا۔ لیکن اگر تمہیں اور میری بیٹی کو اُسے میرا نام دینے میں کوئی اعتراض یا رکاوٹ نہ ہو تو یہ میرے لیے غیر معمولی خوشی کا باعث ہو گا۔

میری بیٹی اور میری نواسی کے لیے سائنوپ سے چھوٹے اور بڑے ڈبے بھیجے جا چکے ہیں۔ اور مَیں نے مرکین سے ہمارے رشتہ دار شاکر آغا کے ذریعے تمہارے والد کو بھیج دیئے ہیں۔ وہ ان سے مل چکے ہیں اور تمہارے والد کو جانتے ہیں۔ تمہیں اُن سے یہ مل جائیں گے اور پھر مجھے اطلاع کر دینا۔ مَیں نے تقریباً ایک ہفتہ قبل تمہیں بیس لیرے بھجوائے تھے، کیا تمہیں وصول ہو گئے ہیں؟ اگر تم تھوڑا لمبا انتظار کر سکتے ہو تو مَیں مہینے کے آخر میں تمہیں تیس یا چالیس لیرے بھجواؤں گا۔ تمہاری کھڈی نے معمول کے مطابق کام شروع کر دیا ہے۔

میری تم سے ایک اور درخواست ہے، میری نظم "Ülkem İnsan Manzaraları" میں ایک مزدور ہے جس کا نام فواد ہے۔ کہانی کے مطابق اسے رہائی ملتی ہے اور وہ ایک فٹر کے طور پر کام کرنے کے لیے ادانہ جاتا ہے۔ اپنے آپ کو اس کی جگہ رکھو اور اپنے خطوط میں اس کے الفاظ میں اس کے دائرہ کار اور دوستوں کے بارے میں چند سطور لکھ کر بھیجو۔ مَیں ان پر کچھ غور و فکر کر کے "Ülkem İnsan Manzaraları" میں استعمال کروں گا۔ اسی طرح ایک جنوبی شہر کے مزدوروں اور کارکنوں کے ماحول کی بھی چند باتیں گو کہ مختصر ہی سہی کتاب میں شامل ہو جائیں گی۔

مجھے صباح الدین (1907-1948ء بائیں بازو کا ایک معروف مصنف اور شاعر، اسے بھی سیاسی نظریات کی بنا پر قید رکھا گیا اور خیال کیا جاتا ہے کہ اسے غیر قانونی طور پر بلغاریہ جانے کے لیے ترکی کی سرحد عبور کرتے ہوئے قتل کر دیا گیا تھا جب کہ اسے پاسپورٹ جاری کرنے سے انکار کر دیا گیا تھا) کا بھی ایک خط ملا ہے۔ اس نے میرے بارے میں تمہیں جو کچھ بتایا تھا اب

اس نے میرے منہ پر سب کچھ کہہ دیا ہے۔اس مرتبہ میں حقیقت میں بہت شرمسار ہوا ہوں۔

پچھلے دو یا تین دن سے، پچھلے تین دن سے زیادہ نہیں، مَیں سُستی اور کاہلی کا شکار رہا ہوں۔کل سے مَیں دوبارہ کام شروع کر رہا ہوں۔

تمہیں آرٹسٹ ابراہیم بار بر تو یاد ہو گا ہی جو یہاں ہے۔اس کی مصوری میں بہت زیادہ اور غیر معمولی بہتری آئی ہے۔ مجھے اس بات پر بہت فخر ہے اور مَیں خوشی سے ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ اس بات پر اتراتا ہوا محسوس کر رہا ہوں، جو کہ ہمارے لوگوں کی اعلیٰ صلاحیتوں اور خوبیوں کی ایک مثال ہے۔

ترکوں کی عظیم قوم! دنیا کے دوسرے تمام لوگوں کی طرح کس قدر تخلیقی صلاحیتوں کی مالک ہے اور قابل تحسین ہے۔اس کے لیے جان دینا کوئی اتنی اہم بات نہیں ہے۔کام کرنے میں عظمت ہے، زندہ رہنا، کام کرنا اور جدوجہد کرنا یہ اصل زندگی ہے۔

مجھے سُلکر "Sulker" کا خط بھی ملا تھا۔مَیں نے جواب دیا تھا لیکن ابھی تک اس جوابی خط کا جواب موصول نہیں ہوا۔(کمال سلکر' 1907-1945ء صحافی، مصنف اور ٹریڈ یونینسٹ، جنہوں نے ترکی میں ٹریڈ یونین تحریک میں اہم کردار ادا کیا۔انہوں نے ناظم حکمت کی سوانح عمری اور ان کے کام پر بہت سی کتابیں لکھیں)۔

مَیں تمہیں اپنے سینے سے لگاتا ہوں۔نہیں، پہلے تمہیں نہیں نہ ہی پہلے اپنی بیٹی کو، حقیقت میں مَیں اس سے قدرے ناراض ہوں۔سب سے پہلے مَیں اپنی نواسی کو گلے لگاؤں گا، پھر تمہیں اور اپنی بیٹی کو۔ مجھے خط لکھتے رہنا۔تم تینوں میرے دل میں بستے ہو، اب جلد ہی تم تعداد میں چار ہو جاؤ گے۔احتیاط رکھنا: جنم دینا ایک کافی خطرناک کام ہے۔

ناظم

O

1946ء

میرے بھائی رشید،

تمہارے دیر سے لکھے گئے خط کا میں دیر سے جواب دے کر کوئی بدلہ نہیں لے رہا۔

یہ محض اس لیے ہوا کہ مَیں بیمار تھا، ہلکی سی ٹھنڈ لگ گئی تھی۔ اب مَیں بالکل ٹھیک ہوں۔ سب سے پہلی بات کہ میرے مستقبل کے نواسے یا نواسی کے لیے ربر کی واٹر پروف شیٹ یہاں سے بھی نہیں مل سکی۔ مَیں نے استنبول سے اس کے لیے آرڈر کر دیا ہے۔ مَیں نے ڈاکٹر سے بھی کہا ہے کہ اگر کوئی ہسپتال میں موجود ہوئی یا اس جگہ سے جہاں سے ہسپتال والے خریدتے ہیں وہ میرے لیے بھی ایک خرید لے گا۔ میرا خیال ہے کہ مَیں جلد ہی تمہیں واٹر پروف شیٹ بھجوا سکوں گا۔ اپنے آخری خط سے پہلے میں نے تمہیں پچیس لیرے بھجوائے تھے، تم نے کوئی ذکر نہیں کیا کہ آیا چالیس لیروں کے بعد تمہیں یہ ملے ہیں یا نہیں۔ مَیں جلد ہی تمہیں کچھ مزید رقم بھجواؤں گا۔ ٹیکسٹائل کے کاروبار کی جانب ہم اس وقت آئیں گے جب فوج کی ملازمت کا معاملہ طے ہو جائے گا۔

پیرائے یہاں تھی۔ اس نے ایک ہفتہ قیام کیا۔ اب وہ واپس چلی گئی ہے۔ اور میری والدہ ایک یا دو روز میں آنے والی ہیں۔ مختصراً گزشتہ دو ماہ اچھے گزر گئے ہیں۔

از رائے کرم لکھنے میں کوتاہی نہ کیا کرو، باقاعدگی سے متواتر لکھتے رہو۔ صرف موقع ملنے پر ہی نہیں بلکہ جتنا زیادہ ممکن ہو سکے، خواہ تمہیں کچھ تکلیف بھی اٹھانی پڑے۔ تم مجھے بہت یاد آتے ہو۔ قید میں ایک آدمی کے لیے ایک اچھا دوست، ایک اچھا کامریڈ، ایک شان دار بھائی اور تخلیقی انسان آدھی آزادی کے مترادف ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ مَیں پہلے بھی تمہیں یہ لکھ چکا ہوں۔ میرے پاس تمہاری کوئی ایک بھی ناخوش گوار یاد نہیں ہے۔ میری یادوں میں تم ایک بے عیب انسان ہو۔

مجھے اپنے بارے میں تفصیل سے بتاؤ کہ معاملات کیسے جا رہے ہیں اور مَیں اس کے مطابق تمہیں کپڑا بھیجوں گا۔ جیسا کہ تم جانتے ہو کہ ایک ماہ کے اندر اندر رقم واپس آنی چاہیے تاکہ کھڈیوں کو چلانے کے لیے سرمایہ میسر رہے۔ یہی وجہ تھی کہ مَیں اس بارے میں کچھ ہچکچاہٹ کا شکار تھا، لیکن اگر تمہاری فوجی ملازمت تھوڑی رہ گئی ہو تو مَیں تمہیں جیسے ہی تم واپس آؤ مال بھجوا سکتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ فروخت سے تمہیں جو کمیشن حاصل ہو گا اس سے تمہیں معقول آمدنی ہو سکتی ہے۔

مَیں اپنی بیٹی اور بہت ہی پیاری یلدز کی آنکھوں کا بوسہ لیتا ہوں، میری دعا ہے کہ

میری بیٹی آرام سے بچے کو جنم دے اور یلدز کو ایک صحت مند بھائی یا بہن مل جائے۔

مَیں یلدز کے سامنے جھوٹا پڑ گیا ہوں۔ مَیں نے اس کے لیے کافی خریدی تھی لیکن مجھے پتا چلا کہ ڈاک خانے والے اجارہ داری والی اشیا قبول نہیں کرتے، لہٰذا مَیں یہ نہیں بھجوا سکتا۔ لیکن مَیں یقیناً اس کے لیے کھلونے ضرور بھجواؤں گا۔

ٹھیک ہے، اس وقت خدا حافظ، مَیں کھڈیوں کی جانب جا رہا ہوں۔ مَیں تم سب کو پیار اور محبت کے ساتھ گلے لگاتا ہوں۔

ناظم

O

رشید میرے بھائی،

مجھے تمہارا خط اور رسائل مل گئے ہیں۔ مَیں فوری طور پر جواب لکھ رہا ہوں۔

مَیں نے تمہیں واٹر پروف شیٹ بھجوا دی ہے، جب تمہیں مل جائے تو مجھے اطلاع کر دینا اور آج مَیں تمہیں پچیس لیرے بھجوا رہا ہوں، ان کے ملنے کی بھی مجھے اطلاع کر دینا۔ پیرائے چلی گئی تھی۔ میری والدہ آئی تھیں، اب وہ بھی جا چکی ہیں۔ مَیں پھر اکیلا رہ گیا ہوں۔ میری والدہ کی آنکھیں حقیقت میں دھندلا گئی ہیں۔ جلد ہی ان کا آپریشن ہوگا۔

مجھے قادر کی نظم بہت زیادہ پسند آئی ہے۔ (عبدالقادر 1985-1917ء مصنف، مترجم اور شاعر ملٹری اکیڈمی کا ایک نوجوان فوجی افسر جسے 1938ء میں گرفتار کیا گیا اور مقدمہ چلایا گیا۔ اس نے ناظم حکمت کے ساتھ جیل میں کچھ وقت گزارا تھا)۔ مجھے تشویش ہے کہ یہ اچھا اور جرأت مند شاعر غذا کی کمی اور بے توجہی سے مر جائے گا، اور مَیں اس کے بارے میں ناقابل بیان حد تک پریشان ہوں، اگر تمہیں اس کا درست پتہ معلوم ہے تو مَیں اس کی مدد کرنا چاہوں گا، اگر کچھ کر سکا۔ مَیں چاہتا ہوں کہ اسے کم از کم کھانے پینے کے لیے ہی کچھ رقم بھجوا سکوں۔ وہ بہرطور ایک اچھا شاعر ہے۔

مَیں تمہیں ایک یا دو روز میں تفصیل سے بتاؤں گا کہ تمہاری کہانی اور سُلکر کی تحریروں کے بارے میں کیا خیالات رکھتا ہوں۔

یلدز ایک حیران کن بچی ہے۔ وہ بڑی ذہین اور فہیم انسان بنے گی۔ میری طرف سے اسے گلے لگاؤ اور بہت سے بوسے دو، لیکن آرام سے اسے تنگ کیے بغیر۔ تمہارے کام کا شیڈول بہت عمدہ ہے۔ مَیں بہت خوش ہوں۔ یہ بات کبھی نہ بھولنا رشید کہ تمہیں عالمی درجے کا مصنف بننا ہوگا۔ ہوائی سفروں کے اس دَور میں محض قومی سطح کا مصنف ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ مَیں کپڑے والی کھڈیوں میں کچھ زیادہ ہی مصروف ہو چکا ہوں اور میرے پاس بہت سے لوگ آتے اور جاتے رہتے ہیں، لہٰذا مَیں اپنے کام سے لاپروائی کا مرتکب ہو رہا ہوں، لیکن آج سے مَیں اس جانب بھی توجہ دینی شروع کر رہا ہوں۔

مَیں بڑی چاہت کے ساتھ آپ سب کو گلے سے لگاتا ہوں۔ یہ خط قدرے مختصر ہے۔ دوسرا خط کل لکھوں گا۔ مَیں یہ خط فوراً بھیج رہا ہوں تاکہ تمہیں انتظار نہ کرنا پڑے۔

ناظم

O

رشید،

مجھے تمہارے خط کا جواب دینے میں کچھ دیر ہوگئی ہے۔ درمیان میں ''یوم جمہوریہ'' آگیا تھا۔ کوئی بھی ڈاک خانے نہیں گیا۔ چور باجی، ریشمی دھاگے کے بارے میں تمہیں خط لکھ رہا ہے۔ بالکل جیسے کہ یورپ میں ہوتا ہے مَیں سمجھتا ہوں کہ ایک مرتبہ ہم اس مشکل موسم سرما سے جان چھڑا لیں تو ہم قدرے خوش حالی حاصل کر لیں گے۔ ایک مرتبہ مارشل لاء اٹھ جاتا ہے تو ہم استنبول میں تمہارے لیے ملازمت تلاش کریں گے۔ ہوسکتا ہے اس وقت تک مجھے بھی رہائی مل جائے۔

کمال طاہر تمہیں بہت سلام بھیجتا ہے۔ مَیں نے اسے محض گنگنانے کے لیے کہی گئی اپنی چھوٹی چھوٹی نظمیں بھیجی تھیں جیسے کہ تمہیں بھی بھیجی تھیں۔ اس نے انہیں بہت زیادہ پسند کیا ہے۔ مَیں ایسی چھوٹی چھوٹی نظمیں ہر شام لکھتا ہوں۔ اس کے ساتھ ساتھ مَیں اپنی طویل نظم ''Ülkem İnsan Manzaraları'' پر بھی کام کر رہا ہوں۔

اب تمہارے ناول کی بات کرتے ہیں۔ فوری طور پر شروع کر دو۔ مَیں اس کام کے

لیے حقیقت میں تم سے درخواست کرتا ہوں۔ اگر تم پسند کرو تو ایک چھوٹے ناول سے ابتدا کرو، لیکن فوراً شروع کردو، فوراً شروع!!!!

تم تصور بھی نہیں کر سکتے کہ جو کچھ تم نے ناظم اور یلدز کے بارے میں لکھا ہے، اُسے پڑھ کر مجھے کتنی خوشی ہوئی ہے۔ مَیں تمہیں مواد مہیا کرنے کے لیے وہ خطوط سنبھال کر رکھ رہا ہوں جو تم مجھے لکھتے ہو۔ ایک دن یہ تمہارے بہت کام آ سکتے ہیں۔

مجھے پیرائے کی طرف سے پچھلے دس دن سے کوئی خط موصول نہیں ہوا۔ مَیں پریشان ہوں۔ کل مَیں ٹیلی گرام بھیجوں گا۔ جیسا کہ تم جانتے ہو، بیٹے کی بیماری کی وجہ سے مَیں خط نہ ملنے پر بہت پریشان ہو جاتا ہوں۔

مَیں اپنی بیٹی کی آنکھوں کو چومتا ہوں۔ اپنے پچھلے چند خطوط میں مَیں نے اسے نظر انداز کیے رکھا ہے، لیکن اسے مطمئن رہنا چاہیے وہ میری حقیقی بیٹی ہے۔ اس نے مجھے ناظم جیسا نواسہ اور یلدز جیسی نواسی دی ہے جو کہ میرے دل میں اس کی جگہ بنانے کے لیے کافی ہیں۔

میرا خیال ہے کہ ہمارا گورنر تحسین بے استعفیٰ دینے والا ہے۔ جیل کے لیے یہ بہت افسوس ناک ہوگا۔

میرے پیارے رشید، زیادہ وقت گزر چکا ہے۔ تھوڑا اور برداشت کر لو۔ اچھے دن زیادہ دُور نہیں ہیں۔ مَیں تم سب کو چاہت کے ساتھ گلے لگاتا ہوں اور تمہارے خط کے انتظار میں ہوں میرے پیارے بھائی!

ناظم

O

رشید میرے بھائی،

مجھے تمہارا خط مل گیا ہے۔ تمہاری زندگی میں نظم اور باقاعدگی پیدا ہو جانے سے مجھے بہت زیادہ خوشی ہوئی ہے۔ مَیں بہت زیادہ پریشان ہوں تمہیں ملازمت سے نکال دیا گیا ہے۔ اب تمہارا کیا کرنے کا ارادہ ہے؟ ریستوران کے منصوبے کا کیا بنا؟ دیکھو رشید تم بڑے آرام سے اچھی گزر بسر کر سکتے ہو اگر تم ہماری کھڈیوں کی مصنوعات کی فروخت میں تھوڑی مزید دلچسپی لیا

شروع کردو۔ نہ صرف اپنی کھڈی کے منافع سے بلکہ دوسری کھڈیوں کی مصنوعات کی فروخت سے حاصل ہونے والا کمیشن تمہارے لیے کافی ہوگا۔ مَیں نے تھوڑا سا مزید سرمایہ حاصل کیا ہے اور کاروبار کو تھوڑی وسعت دی ہے۔ یارن کا کاروبار زیادہ مشکل ہو رہا ہے۔ مَیں لینن (کپڑے کی ایک قسم) وغیرہ کی جانب آ گیا ہوں۔ ابھی تک مَیں تجرباتی دَور میں ہوں، مَیں تمہیں اپنی پیداوار کے نمونے بھیجوں گا۔ اگر تم ان کی فروخت کا بندوبست کرلو تو جب تم اپنی کھڈی کے منافع کو بھی شامل کرو گے تو تم فیکٹری میں ملازمت کرنے سے زیادہ کمالو گے۔ اگر مَیں تمہیں شوخ رنگوں میں میزوں پر بچھانے والے چوڑے میز پوش بھیجوں جیسا کہ مَیں نے پہلے بھیجا تھا، تو تمہارا کیا خیال ہے تم کتنے بیچ سکتے ہو؟ مجھے اس بارے میں ایک اندازہ بتاؤ تا کہ مَیں کھڈیوں کو اس کے مطابق سیٹ کرسکوں۔ ان سیٹوں کے یہاں خریدار کوئی نہیں ہیں۔ مَیں تمہیں اگلی ڈاک میں ایک چوڑا نیپکن اور چارخانے کپڑے کے دو نمونے ارسال کروں گا۔ ان کے بارے میں دکانوں سے پوچھنا اور اگر تم ہول سیل آرڈر حاصل کرسکو تو مجھے فوراً اطلاع دینا۔

جہاں تک ادب کا تعلق ہے۔

1- فرانسیسی کو نظر انداز نہ کرو۔

2- یقیناً تم اب ایسے مقام پر ہو جہاں سے تم ایک دم آگے نکل جاؤ گے اور یہ کامیابی تمہاری مستقبل کی ادبی سرگرمیوں پر بہت بڑا اثر ڈالے گی۔ مجھے پختہ یقین ہے کہ تم میرے ملک کے ایک بلند پایہ ادیب بنو گے۔ مَیں لوگوں کی مختلف خوبیوں یا صلاحیتوں کا اندازہ لگانے میں اکثر غلطی کر جاتا ہوں۔ اگر کوئی ایسا میدان ہے جہاں مَیں غلطی نہیں کرسکتا تو وہ لوگوں کی ادبی اور فنکارانہ صلاحیتوں کا اندازہ لگانا ہے۔ یہ واحد میدان ہے جہاں مجھے دھوکا نہیں ہو سکتا۔ تمام پہلوؤں سے تمہارے اندر وہ اہم خصوصیات موجود ہیں جو ایک فنکار کے لیے ضروری ہوتی ہیں۔ مجھے تمہاری صلاحیتوں پر بھرپور اعتماد ہے۔

میری تیسری کتاب بہت زیادہ ضخیم ہو چکی ہے۔ مَیں اس میں سے کچھ بند تمہیں بھیجوں گا۔ مجھے دوبارہ بے خوابی کی شکایت شروع ہوگئی ہے۔ ہر روز میرے وزن میں کمی ہو رہی ہے۔ لیکن میری زندگی کی خوشیاں اور میری امیدیں ہمیشہ کی طرح اپنی جگہ پر قائم ہیں۔

تم نے اپنے آخری خط میں میری بیٹی اور میرے نواسے اور نواسی کا کوئی ذکر نہیں کیا۔
ئیں انہیں بہت یاد کرتا ہوں۔ یلدز کو میری جانب سے گلے لگاؤ اور اسے بتاؤ کہ تم اُسے اس کے
نانا کی طرف سے چوم رہے ہو اور اسے تمہیں ایسے ہی چومنا چاہیے جیسے وہ اپنے نانا کو چوم رہی ہو۔
یہاں وہی کچھ چل رہا ہے جو تم اچھی طرح جانتے ہو۔ایک خبر، کاظم بے رہا ہو گیا ہے،
رہائی کے وقت وہ رو پڑا تھا۔اس میں جو بھی خامیاں تھیں لیکن وہ ایک اچھا انسان تھا۔
چور باجی، وصفی اور سری یر والا سب تمہیں بہت بہت سلام کہہ رہے ہیں۔ گورنر اور
رجسٹرار بھی سلام عرض کرر ہے ہیں۔
ئیں تمہیں ایک بات بتانے والا ہوں جو تمہیں پریشان اور غمگین کر دے گی۔ میری
پیاری والدہ کی آنکھوں میں موتیا اتر آیا ہے۔ئیں اس بارے میں بہت زیادہ پریشان ہوں اور
غالباً میری بے خوابی کی بھی یہی وجہ ہے۔خیر، اب ئیں تمہیں خدا حافظ کہتا ہوں۔
ئیں تم سب کو چاہت اور دل کی گہرائیوں سے گلے لگاتا ہوں۔

ناظم

O

1947ء

رشید،

مجھے تمہاری نئے سال کی مبارک باد موصول ہو گئی ہے۔ئیں تمہیں، تمہاری بیوی کو اور
اپنے نواسے اور نواسی کو سال نو کی مبارک باد پیش کرتا ہوں اور ایک خوشیوں بھرے نئے سال کے
لیے دعا گو ہوں۔ئیں بہت خوش ہوں گا اگر تم اپنی ایک تازہ کھینچی گئی تصویر بھجوا دو۔ پھر ئیں اندازہ
لگا سکوں گا کہ تم کتنے بوڑھے ہو چکے ہو اور میری بیٹی کتنی زیادہ مزید خوب صورت ہو چکی ہے اور
یلدز کس قدر ایک خوب صورت لڑکی بن چکی ہے اور ناظم کس طرح سے ایک نوجوان آدمی بننے کی
جانب پروان چڑھ رہا ہے۔
لفافے میں ئیں تمہیں خواتین کے لیے اُونی کپڑے کے نمونے بھجوا رہا ہوں۔یہ دہری
چوڑائی کے ہیں، جو کہ 136 سینٹی میٹر ہے اور یہ بہت سے دوسرے رنگوں میں بھی ہیں۔اگر تم انہیں

ہول سیل میں 8 لیروں میں بیچ سکو تو میرے لیے یہ بہت اچھی بات ہو گی۔ مَیں نے ایک حماقت کی اور رقم ادھار لے کر انہیں بنایا، لیکن لعنت ہو اس قید پر، انہیں بیچ نہیں سکا۔ اس وقت میرا انحصار تم پر ہے، رشید آفندی۔

اگر تم اسے 8 لیروں سے زیادہ میں بیچتے ہو (میرا خرچ آٹھ لیرے ہے) تو پھر مَیں تمہیں پچاس فی صد کمیشن دے سکتا ہوں۔

مَیں پوری چاہت کے ساتھ تمہیں، اپنی بیٹی اور نواسی اور نواسے کو گلے لگاتا ہوں۔

ناظم

O

1947ء

رشید میرے بھائی،

اگر میرے خطوط کی تعداد اور تواتر میں کوئی کمی آ گئی ہے تو اس کے باوجود تمہارے لیے، اپنی بیٹی کے لیے، اپنی نواسی اور نواسے کے لیے میری محبت اور شفقت میں ذرہ برابر بھی کمی نہیں آئی۔ میرے خاندان کے اندر تم لوگ ان پہلے افراد میں سے ہو جن سے مَیں بہت زیادہ محبت کرتا ہوں۔ بعض اوقات مَیں تمہاری جدائی کو بڑی شدت سے محسوس کرتا ہوں۔ اور پھر بعض اوقات مَیں تم سب کے بہت زیادہ خوش ہونے کا سوچ کر بہت خوشی محسوس کرتا ہوں۔ تمہاری تصویریں اور تمہارے فوٹو سب میرے بستر کے قریب پڑے ہیں۔

مَیں جیسا کہ تم چھوڑ کر گئے تھے بالکل ویسے کا ویسا ہوں، یا شاید یہ میری اپنی سوچ ہے۔ لیکن اگر تم مجھے دیکھو تو شاید تم مجھے قدرے عمر رسیدہ پاؤ یا پھر شاید اس کے برعکس پہلے سے زیادہ جوان پاؤ۔

اگر تم ایک گروپ فوٹو بنا کے مجھے بھیجو تو یہ میرے لیے بہت خوشی کا باعث ہو گا۔

میرے پاس تمہاری ہر سال کی فوٹو موجود ہے لیکن 1947ء کے سال کی کوئی فوٹو نہیں ہے۔

تم یقیناً اچھی چیزیں لکھ رہے ہو۔ پچھلے دنوں مَیں نے تمہاری ایک کہانی پڑھی ہے اور میں فخر محسوس کر رہا ہوں۔ مَیں تمہارے ناول کی اشاعت کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہا ہوں

جیسا کہ مَیں کسی تہوار کا انتظار کرتا ہوں۔

مَیں تمہیں، اپنی بیٹی اور اپنی نواسی اور نواسے کو بھینچ کر اپنے سینے سے لگاتا ہوں۔ تم سب مجھے بہت زیادہ پیارے ہو۔

ناظم

O

15-2-1949

رشید، میرے بیٹے

مجھے کل تمہارا خط ملا ہے اور میں فوراً جواب دے رہا ہوں۔ تم نے میرے متعلق بہت خوب صورت باتیں لکھی ہیں، شکریہ۔ تمہاری یادوں میں ایک اس قدر اچھے آدمی کے طور پر زندہ رہنے پر مَیں تمہارے تصور سے بھی زیادہ خوشی محسوس کر رہا ہوں۔ مَیں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ بالکل اسی طرح تم بھی میرے وجود کی گہرائیوں میں، میرے دل میں اور میری سوچوں میں زندہ ہو۔ فن وادب کے میدان میں تمہاری ہر کامیابی میرے لیے خود میری کامیابی کے مترادف ہے۔ تم ترک قوم، یعنی انسانیت، ہمارے ملک اور اس خوب صورت دنیا کا فرد کہلانے کے شایانِ شان انسان ہو۔ جہاں تک تمہارے ناول کا تعلق ہے، جیسے ہی یہ مجھے موصول ہوا، مَیں نے ایک نشست میں اسے مکمل پڑھ کر دم لیا۔ اسے پڑھ کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ پھر ایک ہفتے بعد مَیں نے اسے دوبارہ پڑھا اور ایک بار پھر تیسری مرتبہ پڑھا۔ میرے پیارے رشید کا پہلا شائع شدہ ناول یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ (''میرے باپ کا گھر''، اورحان کمال کے دو سوانحی ناولوں میں سے پہلا ناول ہے۔ دوسرا ناول ''بے کار کے مہ و سال'' ہے۔ یہ دونوں ناول اورحان کمال کے بچپن سے شادی تک اوائل جوانی کے دَور کا احاطہ کرتے ہیں)۔

اب میری بات سنو! یہ پہلو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے کہ یہ کام چار جلدوں پر مشتمل ہوگا، اور اس وقت ہمارے ہاتھ میں محض پہلی جلد ہے، اور یہ کہ کسی بھی فن پارے کی طرح ناول ایک مکمل ڈھانچا بھی ہوتا ہے، اور یہ کہ کام کی مختلف جلدوں میں تقسیم میں تکنیکی غلطیاں سرزد ہو سکتی ہیں۔ (مَیں نے کیا خوب جملہ تشکیل دیا ہے یہ ایک عدالتی حکم نامے کی طرح ہے) ٹھیک ہے، کسی

بھی چیز کو نظر انداز کیے بغیر جن کا مَیں نے اس جملے میں ذکر کیا ہے، میری بات سنو۔ اوّل، میری رائے میں، پہلے دو حصوں کے مقابلے میں، وہ تیسرا حصہ قدرے کمزور اور لمبا ہے جس میں ادانہ سے شام واپسی کے دَور کا احاطہ کیا گیا ہے جب کہ بہتر تھا لمبا حصہ تمہارے والد کی صحافت اور پارٹی کے کاموں میں بسر کیے جانے والے برسوں والا حصہ ہوتا۔ حقیقت میں یہ حصہ بہت مختصر ہے، اور اس میں بہت کم کردار ہیں۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ یہ صرف ایک بچے کی یادداشتیں ہیں بلکہ بچپن کی یادیں ہیں، لیکن پھر بھی مَیں سمجھتا ہوں کہ اگر اس حصے میں قدرے مزید تفصیل اور حاشیہ آرائی سے کام لیا گیا ہوتا تو بہتر ہوتا۔

شام میں بسر کی گئی زندگی کی عکاسی بڑے حقیقی انداز میں کی گئی ہے۔ کردار جیتے جاگتے اور زندہ ہیں۔ مَیں ان کو حقیقی دنیا کے کرداروں کی طرح محسوس کر سکتا ہوں۔ لہٰذا مَیں پہلی جلد کو دوسری جلد کے ساتھ جمع کر دینے کے حق میں ہوں۔ اگلی مرتبہ جب دوسرے ایڈیشن کے شائع ہونے کی اُمید کی جاتی ہے، اُسے ایک کتاب کی شکل میں شائع کیا جائے اور اسے جلد اوّل اور دوسرے کو حصہ دوئم کا نام دیا جائے۔ لہٰذا مَیں اس حصے "میرے باپ کا گھر" سے مطمئن ہوں جسے ہم پہلی جلد کا حصہ اوّل کہیں گے۔ مَیں اس کی زبان سے بہت پیار کرتا ہوں تم اب ایک ایسے ادیب بن چکے ہو جو بہترین ترکی زبان لکھتا ہے۔ تم نے بہت اچھا کام کیا ہے۔ تمہارے ہاتھوں پر رحمت نازل ہو۔ مَیں کمال کا ناول واپس بھیجنے کے قابل نہیں ہوں۔ مجھے اس کے ساتھ اور عام طور پر کسی بھی سیاسی قیدی کے ساتھ بات چیت کرنے یا تعلق رکھنے سے روک دیا گیا ہے۔

میرا خیال ہے کہ یہ صرف تم رہ گئے ہو جس نے یہ بات نہیں سنی۔ مَیں ایک مکمل احمقانہ حرکت کر چکا ہوں۔ ایک ایسی حرکت جو کسی طور پر بھی سمجھ میں آنے والی نہیں ہے۔ مَیں نے پیرائے کو طلاق دینے کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن مَیں اب ہسٹریا کے اس دورے کے بعد اپنے حواس میں واپس آ چکا ہوں جس نے مجھے میری شہرت اور صحت کے حوالے سے مجھے بہت زیادہ نقصان پہنچایا ہے۔ اب مجھے سمجھ نہیں آ رہی کہ تمہاری بھابی سے معافی مانگنے کے لیے کیا کروں۔ کیا تمہیں کبھی یہ گمان بھی گزرا تھا کہ میں ایسی احمقانہ حرکت کروں گا؟ برائے مہربانی اس کا ذکر میری بیٹی سے نہ کرنا، مجھے شرمندگی ہوگی۔ اپنے کسی آئندہ خط میں مَیں تمہیں تفصیل سے لکھوں گا کہ مَیں کس طرح

اس مصیبت میں مبتلا ہوا، خاص طور پر اس کے نفسیاتی پہلو پر روشنی ڈالوں گا۔ تم ایک ناول نگار ہو، تمہیں اس کی ضرورت ہوسکتی ہے۔ لیکن ابھی وقتی طور پر زخم بہت تازہ ہے اور اس کے مکمل طور پر تبدیل ہوجانے کے بعد ہی مَیں اس پر غور کرسکوں گا کہ مجھ پر کیا گزری تھی اور اس کا معروضی تجزیہ کرسکوں گا۔

مَیں اپنی بیٹی کو بار بار سلام عرض کرتا ہوں۔ بالکل اسی طرح جس طرح میری زندگی کی سب سے بڑی خوش قسمتی اور شادمانی تمہاری بھابی پیرائے جیسی خاتون سے ملاقات اور اس کی محبت، دوستی، صحبت اور مروت کو حاصل کرنا ہے، تمہاری سب سے بڑی خوش قسمتی میری بیٹی سے ملاقات ہوجانا ہے۔ تمہارے اور میرے جیسے لوگوں کی زندگیوں پر خواتین گہرے اثرات مرتب کرتی ہیں جسے تم ابھی نہیں سمجھ سکتے۔ خواتین ہماری کامیابیوں اور ناکامیوں میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ تمہیں میری بیٹی کی قدر و قیمت اور اہمیت کو تسلیم کرنا چاہیے۔ تمہارے خطوط میں اس کا حوالہ تعریف و توصیف سے بھرا ہوتا ہے اور یہ بات مجھے بے انتہا خوشی دیتی ہے۔

مجھے اس بات کی بھی بہت خوشی ہے کہ تم نے مے نوشی چھوڑ دی ہے۔ تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ مَیں اپنے نواسے اور نواسی سے ملنے کے لیے کس قدر بے تاب ہوں۔ یہ کیسی عجیب بات ہے کہ بہت سے لوگ ایسے ہیں جن سے مَیں محبت کرتا ہوں لیکن مَیں نے ان کے چہرے کبھی نہیں دیکھے اور نہ ہی ان کی کبھی آوازیں سنی ہیں۔ کچھ تو جو پیدا ہوئے ہیں اور بڑے ہوگئے ہیں لیکن مَیں نے انہیں نہیں دیکھا اور کچھ وہ بھی ہیں جو اب اس دنیا میں نہیں رہے۔

مَیں تمہاری تصویر کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہا ہوں۔ ایک ایسی تصویر جو کسی شوقیہ تصویر لینے والے نوآموز نے کھینچی ہو اور جس پر کوئی لچنگ وغیرہ نہ کی گئی ہو۔ ایسی تصویریں کسی انسان کی حقیقی عکاسی کررہی ہوتی ہیں۔ اپنے اگلے خط میں مَیں تمہیں اپنی تصویر بھیجوں گا۔ تمہیں علم ہے (خیر، تمہیں کیسے علم ہوسکتا ہے؟) کہ میری والدہ پچھلے ایک ماہ سے یہاں ہیں۔ وہ ہر سوموار اور بدھ کو مجھے ملنے آتی ہیں۔ مَیں ان کا اتنا عادی ہوچکا ہوں کہ میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ مَیں کیا کروں گا جب وہ اگلے ماہ واپس ادانہ چلی جائیں گی۔

مَیں اپنی بیٹی اپنے نواسے اور نواسی اور تم کو بھینچ کر سینے سے لگاتا ہوں۔ اپنے والد کو میرا

سلام عرض کرنا، مَیں تمہاری والدہ کے ہاتھوں کو چومتا ہوں۔ وہ لوگ جو یہاں تمہیں جانتے ہیں
سب سلام عرض کرر ہے ہیں۔ خدا حافظ میرے شیر کے بیٹے......

ناظم

پڑھا گیا

ڈیوٹی انسپکٹر کے دستخط

O

6-6-1949

رشید میرے بھائی!

جواب میں تاخیر کوئی جوابی کارروائی نہیں ہے۔ اس کی وجہ محض یہ ہے کہ بعض اوقات مَیں جیل کے مزاج میں رنگا جاتا ہوں اور محض بے کار اور سست بیٹھا رہتا ہوں۔ بہار، جیل میں بہار جیسا کہ تم جانتے ہو گے کہ مَیں اپنی جگہ سے ہلنا بھی پسند نہیں کرتا۔

مجھے خوشی ہے کہ تمہارے ناول کے بارے میں میرے نظریات درست ثابت ہوئے ہیں: کہ پہلی کتاب محض جلدوں میں سے ایک ہے۔ اور تکنیکی وجوہات تھیں کہ انہوں نے اس کی قطع و برید کی۔ میرا مطلب ہے کہ مَیں خوش نہیں ہوں کہ قطع و برید کی گئی، لیکن قطع و برید سے قبل اصل جلد تکنیکی نقطہ نظر سے زیادہ پُراثر انداز میں تشکیل دی گئی تھی۔ تاہم دوسری جلدوں میں اس قسم کی قطع و برید کے لیے متفق نہ ہونا اور پہلی جلد کو ایک مرتبہ دوبارہ بغیر کسی قطع و برید کے شائع کروانے کی کوشش کرو۔ تم تصور نہیں کر سکتے کہ کس قدر اشتیاق سے مَیں تمہارے دوسرے ناولوں کی شاعت کا انتظار کر رہا ہوں، جس کی اچھی خبر تم نے مجھے ابھی ابھی دی ہے۔

جہاں تک میری صحت کا تعلق ہے، اگرچہ خوب نہیں لیکن غنیمت ہے۔ کچھ خارش پیدا کرنے والے داغ جو چھونے پر قدرے سخت محسوس ہوتے ہیں، میرے چہرے، ناک اور پیشانی پر نمودار ہوئے ہیں، اور ان کی وجہ سے مَیں حقیقت میں پریشان ہوں۔

مَیں یلدز کے ڈینٹل اسسٹنٹ بننے کے خیال کو پسند کرتا ہوں۔ جب وہ اس کے لیے تیاری کر رہی ہے اُسے اپنی تعلیم بھی جاری رکھنی چاہیے۔ جب تم اس کی عمر میں تھے، تم کس حد تک

کالعدم الوجود تھے، لیکن تم بہت اچھے ثابت ہوئے ہو۔ یلدز نے تم پر ہی جانا ہے۔ تم مجھے اپنے خاندان کی ایک تصویر ضرور بھیجو۔ وہ کتاب جس کے بارے میں تم نے بتایا ہے کہ لکھنے کی تیاری کر رہے ہو جس میں تم میری بیٹی کو نمایاں اور ہیروئن کے کردار میں پیش کرو گے، ایک شہ پارہ ہوگی۔ وہ اس دنیا میں تمہاری سب سے قیمتی چیز ہے۔ میرے ہم نام کا کیا حال ہے؟ یلدز تم پر گئی ہے لیکن میری خواہش یہ تھی کہ وہ اپنی ماں پر جاتی۔ مجھے تمہارے والد کی بیماری پر بہت افسوس ہے۔ ان کی جلد صحت یابی کے لیے میری نیک خواہشات اور میرا اسلام ان تک پہنچا دینا۔ جس جگہ ہم اب ہیں وہ کام کی جگہ بننے جا رہی ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ یہ کب ہوگا؟ اگر اس کام کی جگہ پر میرے لیے کوئی کام نکل آتا ہے تو پھر کچھ آمدنی کے ساتھ ساتھ میرا وقت بھی اچھا گزر جایا کرے گا، اور یہ ایک اچھی ورزش بھی ہو جایا کرے گی۔

تو پیارے بھائی، کچھ اس طرح سے معاملات چل رہے ہیں۔ مجھے تمہاری بھابی کی کوئی خبر نہیں ملی۔ وہ مجھ پر بہت زیادہ برہم ہے اور اس میں وہ اسی فیصد درست بھی ہے۔ اس مسئلے پر خود میں بھی اپنے آپ سے 75 فیصد ناراض ہوں۔

ایک مرتبہ پھر خدا حافظ۔ میں اپنی بیٹی اور اپنی نواسی اور نواسے کو دلی چاہت کے ساتھ گلے لگاتا ہوں، میرے پیارے بیٹے۔

ناظم

پڑھا گیا 6-6-1949

دستخط، قائم مقام گورنر

O

27-10-1949

بورصہ جیل

رشید میرے بیٹے،

مجھے تمہارا خط مل گیا ہے۔ اس سے پہلے مختصر کہانیوں کی کتاب (منتخب مختصر کہانیوں Seçilmiş Hikâyeler کی طرف اشارہ ہے، جس میں نمایاں ادیبوں کی کہانیاں شامل تھیں) اور

رسائل جوتم نے بھیجے تھے مل گئے تھے۔ مختصر کہانیوں کے اس رسالے کا ایک اور ایشو میرے ہاتھ لگا تھا۔ کیا میں تمہیں دو باتیں بتاؤں جو ہمارے لیے خوشی کا باعث ہونی چاہئیں۔ کچھ تکنیکی کوتاہیوں کے باوجود اس کتاب میں شامل تمام مختصر کہانیاں بہت عمدہ اور اُمید افزا ہیں۔ آج ترکی میں مختصر کہانی لکھنے کا فن عمومی سطح پر درست سمت میں جا رہا ہے۔ ایک تو یہ بات ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ان مختصر کہانیوں میں سے سب سے اعلیٰ اور فنی طور پر پختہ تمہاری کہانیاں ہیں، ایک کہانی کو تو ہم ایک چھوٹا شہ پارہ قرار دے سکتے ہیں۔ تمہارے ہاتھوں اور دل پر رحمت نازل ہوں، پیارے رشید۔

جہاں تک تصویر کا تعلق ہے، یہ دو یا تین سال قبل لی گئی تصویر ہے۔ مَیں نہیں جانتا کہ انہوں نے یہ کہاں سے اور کس ذریعے سے حاصل کی ہے۔ بہرحال جو بھی معاملہ ہے مَیں صرف فوٹو پر ہی حیران نہیں ہوں بلکہ ان تمام باتوں پر بھی حیرانی اور غصہ ہے جو مجھ سے منسوب کی گئی ہیں۔ لیکن جو بھی ہے تحمل اور استقلال کی ضرورت ہے۔

مَیں اپنے پوتے، پوتی اور بہو کو اور تم کو دلی چاہت کے ساتھ سینے سے لگاتا ہوں اور تم سے درخواست ہے کہ مجھے خط لکھتے رہا کرو، میرے پیارے بھائی۔

ناظم

O

6-11-1949

رشید میرے بیٹے،

مجھے تمہارا خط اور کتاب (اورحان کمال کی مختصر کہانیوں کی کتاب "Ekmek Kavgası" (زندہ رہنے کے لیے جنگ)) موصول ہوگئی ہے۔ شکریہ! چلو کتاب کے بارے میں بات کرتے ہیں۔ پرنٹنگ مجھے پسند نہیں آئی۔ میری خواہش ہے کہ یہ اچھے کاغذ پر سرورق کے اچھے ڈیزائن کے ساتھ شائع ہوتی۔ لیکن ہم کیا کر سکتے ہیں؟ ہمیں اس کے لیے بھی شکرگزار ہونا پڑتا ہے۔

کتاب میں تمہاری تصویر پر بھی مَیں خوش نہیں ہوں۔ یہ توہین آمیز ہے۔ تم نے اُنہیں ایسی تصویر چھاپنے کی کیوں اجازت دی۔ اگر کتاب میں تصویر لگانا ہی ہو تو ایسی تصویر ہونی

چاہیے جس کی کچھ فنکارانہ اہمیت بھی ہو۔

آیئے اب ذرا کام کا جائزہ لیتے ہیں۔ مختصر الفاظ میں تو یہ ہے کہ یہ تمہارے اور ترک قوم کے شایانِ شان کام ہے۔ اور کچھ کہانیاں تو اتنی ماہرانہ، برمحل، اچھی اور بے عیب ہیں کہ انہیں مختصر کہانیوں کے عالمی ادب میں جگہ دی جا سکتی ہے۔ میرا دل خوشی سے لبریز ہے، اور بہت زیادہ فخر محسوس کر رہا ہوں۔ مَیں نے ایک رات میں کتاب ختم کر دی تھی۔ میں نے کہانیوں کے نیچے کچھ آراء لکھی ہیں یہ تمہیں بھیج رہا ہوں۔

"Revir Meydancısı Yusuf" (یوسف، شفاخانے کا اردلی) اچھی۔

"Mahalle Bekçisi Ali" (علی، رات کا چوکیدار) بہت اچھی، اختتام غیر ضروری ہے، کہانی پہلے ختم ہو جانی چاہیے۔

"Köpek Yavrusu" (پلا) بہت اچھی۔

"Ekmek, Sabun ve Aşk" (روٹی، صابن اور محبت) بہت اچھی۔

"Bir Öksuz Kız Etrafında" (ایک یتیم لڑکی کے گرد) اچھی۔

"Bir Ölüye Dair" (مردہ شخص کے بارے میں) اچھی۔

"Bir İnsan" (ایک انسان) اچھی، یہ مختصر ہو سکتی تھی۔

"Bir Kadın" (ایک عورت) بہت اچھی۔

"Bir Yılbaşi Macerası" (نئے سال کی مہم) بہت اچھی۔

"Uyku" (نیند) شاندار۔

"Dönüş" (واپسی) یہ ایک چھوٹا شہ پارہ ہے۔

"Kitap Satmaya Dair" (کتابیں بیچنے کے بارے میں) بہت اچھی۔

کچھ کا اختتام کم و بیش ایک سا تھا۔

"Propagandacı" (مبلغ) اچھی۔

"Yemişçi" (خشک میوہ اور جوز بیچنے والا) اچھی۔

"Çocuk Ali" (علی چھوٹا بچہ) بہت عمدہ۔

پیشِ نظر کتاب ہمارے واٹس ایپ گروپ کے سکالرز کی طلب پہ سافٹ میں تبدیل کی گئی ہے۔ مصنفِ کتاب کے لیے نیک خواہشات کے ساتھ سافٹ بنانے والوں کے حق میں دعائے خیر کی استدعا ہے۔

زیرِ نظر کتاب فیس بک گروپ ''کتب خانہ'' میں بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے۔
گروپ کا لنک ملاحظہ کیجیے :

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share

میر ظہیر عباس روستمانی

03072128068

میرے پیارے، اب میں چند تکنیکی نکات بیان کروں گا۔ خواہ شاعری ہو یا نثر، ایسے جملے جو اوقاف و رموز کی مدد سے تشکیل دیئے گئے ہوں، مشکوک جملے ہوتے ہیں۔ میرا مطلب ہے یہ ایسے جملے ہوتے ہیں اگر ان میں اوقاف لگنے سے رہ جائیں تو ان کا مطلب تبدیل یا مبہم ہوسکتا ہے۔

ہمارے ادیب اس جانب کوئی توجہ نہیں دیتے۔ میں تمہیں مشورہ دیتا ہوں کہ جملے کو اس طرح سے ترتیب دیا کرو کہ بغیر اوقاف کے بھی اس کا مطلب آسانی سے سمجھ میں آرہا ہو۔ آپ انہیں ثانوی لوازم کے طور پر استعمال کر سکتے ہیں۔

دراصل، اگر ایک جملے کا ختم ہونا اور دوسرے جملے کا شروع ہونا صرف فل سٹاپ کے استعمال ہی سے واضح ہوتا ہو تو یہ سمجھ جانا چاہیے کہ دونوں جملے درست طور پر ترتیب نہیں دیئے گئے۔ میں اپنی بات پھر دہرا رہا ہوں، جملے جو بغیر رموز و اوقاف کے پوری طرح سمجھ نہ آئیں یا سمجھنے میں مشکل پیش آتی ہو، ایسے جملے ہوتے ہیں جو غلط طور پر ترتیب دیئے گئے ہوتے ہیں، مردہ پیدا ہوئے ہوتے ہیں اور مردہ ترتیب کے حامل ہوتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ تشبیہات کے استعمال میں ہمیں بہت محتاط ہونا چاہیے۔ تم بعض اوقات تشبیہ کے استعمال میں غلو سے کام لیتے ہو۔ ایک ہی جملے میں دو تشبیہوں کا استعمال یا تشبیہات کا سلسلہ اچھا نہیں لگتا، یہ ایک دوسرے کا تاثر زائل کر دیتی ہیں، یا ایک دوسرے کو دھندلا دیتی ہیں۔

ایک اور نکتہ:

"مقامی بچے جوا سے گھیرے ہوئے تھے، وہ شرارتی تھے اور شیطان تھے۔"

میں ماضی میں، کسی حد تک جان بوجھ کر، یہ غلطی کرتا رہا ہوں۔ تمہیں اس سے بچنا چاہیے۔ یوں لکھنا چاہیے: "وہ شرارتی اور شیطان تھے۔"

آج حقیقت پسندی دو سمتوں میں پروان چڑھ رہی ہے۔ ایک سمت وہ رجحان ہے جو انجام کار وجودیت کی طرف لے کر جاتا ہے جو کہ رجعت پسندانہ اور امید سے عاری اور انسانیت کو مایوسی میں دھکیلنے کا باعث بنتا ہے، یہ بیکار ہے اور آخر میں حقیقت سے ہمارے روابط کو ختم کر دیتا ہے۔ دوسری سمت وہ رجحان ہے جو رومانیت کی نئی اور تخلیقی قسم سے تعلق قائم کرتا ہے، یہ تسلیم کرتا

ہے کہ فنکار روح کا مہندس ہوتا ہے اور اس وجہ سے یہ حقیقت کی بہتر نمائندگی کرتا ہے۔

تمہاری بعض مختصر کہانیاں نہ صرف کہ افسردہ ہیں بلکہ ان میں مایوسی کا عنصر بھی پایا جاتا ہے۔ حالیہ برسوں میں، بعض واضح وجوہات کی بنا پر، خاص طور پر ہماری مختصر کہانیوں کے مصنفین میں، اس رجحان میں اضافہ ہوا ہے۔ حقیقت کو اس کے تاریخی حوالوں سے پرکھا جائے تو یہ کبھی بھی مایوسی کو جنم نہیں دیتی۔ اس کے اپنے افسردہ، اذیت ناک، تلخ، دھندلے، نفرت انگیز، گھناؤنے، حقارت آمیز اور ناگوار پہلو ہیں۔ ان پہلوؤں کو پیش کرنے میں ہلکی سی کوتاہی انسانیت کو غیر جانب داری اور پُرامیدی کے ساتھ پیش کرنے میں سدراہ ہو سکتی ہے، اور اس کا مطلب حقیقت سے دُور ہو جاتا ہے۔ لیکن اس سب کے باوجود، انسانی کاموں کے ذریعے، یہ حقیقت بہتر اور زیادہ خوش گوار انداز میں پروان چڑھ رہی ہے۔ جو کچھ پروان چڑھ رہا ہے وہ اُمید اور خوشی سے خالی نہیں ہے۔

میں اس نکتے پر زور دے رہا ہوں کیوں کہ ایک فرد میں پائی جانے والی اُمید یا نااُمیدی کا تعلق صرف اس فرد کے ذات سے ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر، یاد رکھو ایک ڈاکٹر جو یہ یقین رکھتا ہو کہ بیماریوں کے خلاف انسانوں کی جدوجہد بے فائدہ ہے، اسے ڈاکٹری کا پیشہ اختیار کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ اسی طرح جو ادیب امید کی جوت نہیں جگاتا اسے ادیب ہونے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے ادیبوں سے اُن کا یہ حق زبردستی نہیں چھینا جا سکتا، لیکن آخرکار حقیقت انہیں نابود کر دیتی ہے۔ شیکسپیئر، Cervantes، بالزاک، ٹالسٹائی، چیخوف اور گورکی جیسے عظیم ادیب بھی بعض اوقات خوف ناک حد تک افسردہ، تلخ اور مایوس نظر آتے ہیں لیکن پھر بھی وہ ہمیشہ پُرامید ہوتے ہیں۔ ''ہیملٹ'' پڑھیں، ''ڈون کوئزوٹ'' دیکھیں، ''وار اینڈ پیس'' اور ''مائی یونیورسٹیز'' کا مطالعہ کریں۔ دوسری جانب، دوستوئیوسکی جو انفرادی طور پر ان کا ہم پلہ ہے آخرکار معدوم ہو جائے گا۔ افسردہ، بیزار اور تلخ ہونے کی وجوہات تو ہو سکتی ہیں، لیکن نااُمید ہونے کی ایک بھی وجہ نہیں ہے۔

دھیان رکھنا، میرے بیٹے! اپنے آپ کو اس سے بچاؤ، اپنی ذات میں تم خواہ کتنے ہی تلخ اور افسردہ کیوں نہ ہو جاؤ لیکن تمہارے اندر سے صرف خوشی اور اُمید کی کرنیں پھوٹنی چاہئیں۔

بس یہی بات ہے۔

میں دوبارہ دہرا رہا ہوں، میں تمہیں اور ترک ادب کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔۔۔۔

بوڑھے اور نوجوان، تم سب کو بھینچ کر سینے کے ساتھ لگاتے ہوئے۔

ناظم

OOO

اورحان کمال

اورحان کمال اور ناظم حکمت
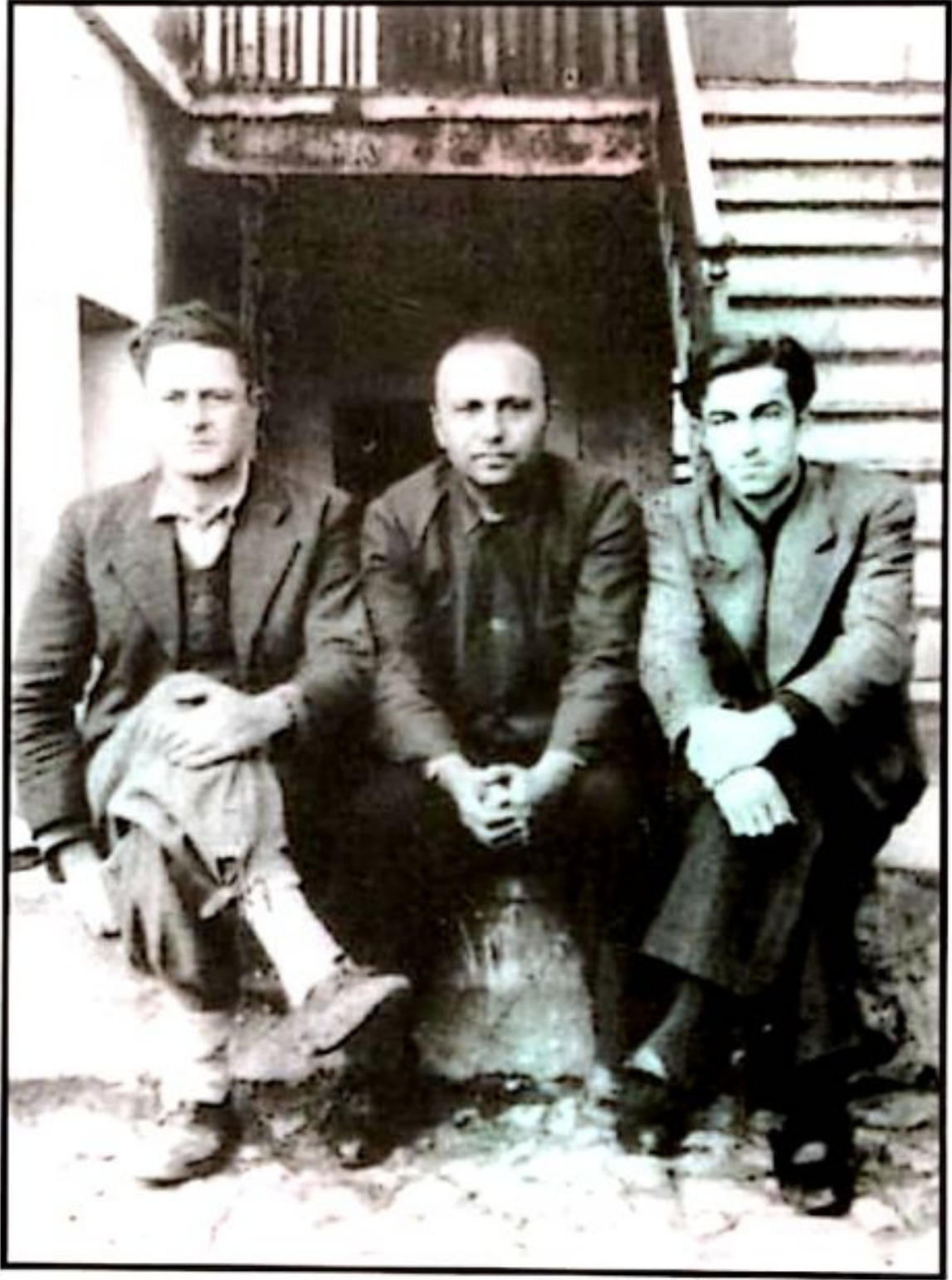
اورحان کمال، اُن کا ایک دوست اور ناظم حکمت

بائیں طرف سے اورحان کمال، ناظم حکمت اور ایک مشترکہ دوست

دائیں جانب کھڑے اورحان کمال اور ساتھ بیٹھے ناظم حکمت و دیگر

ناظم حکمت اپنے سیل کے سامنے
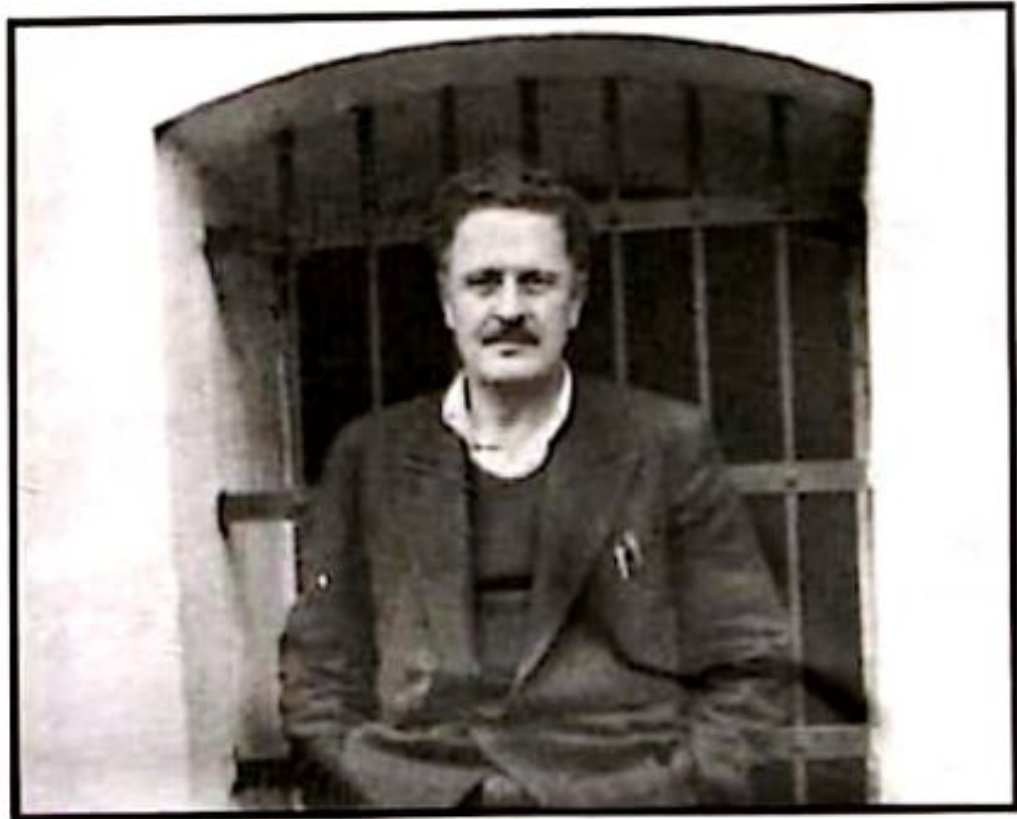
اورحان کمال۔ ناظم حکمت

ناظم حکمت جیل میں، اُن کی اپنی بنائی ہوئی ایک پینٹنگ

KR-389-329
فرخ سہیل گوئندی
جمہوری
JUMHOORI
9 789699 739170